ملت کا ترجمان

ماہنامہ جام نور دہلی

خصوصی شمارہ

Rs. 15/-

AUGUST 2007

- انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسباب اور نتائج
- علما و قائدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء
- انقلاب ۱۸۵۷ء میں اردو زبان کا کردار
- انقلاب ۱۸۵۷ء ناکام کیوں ہو گیا؟
- سنہ ۱۸۵۷ء: ۱۵۰ سالہ تاریخ اور عصری تصورات
- مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی

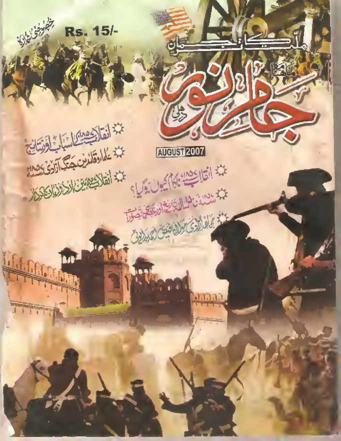

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[illegible]

[illegible]

ملت کا ترجمان

ماہنامہ جام نور دہلی

فیض العارفین حضرت علامہ شاہ غلام آسی پیا حسنی

رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری نور اللہ مرقدہ

پانچواں دور | اگست ۲۰۰۷ء | ۵۸ / واں جام

رجب المرجب / شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ

مدیر اعلیٰ	خوشتر نورانی
مشیر اعلیٰ	محمد احمد اشرفی مصباحی
مدیر	ذیشان احمد مصباحی
سرکولیشن منیجر	محمد عارف فیضی
اشتہار منیجر	غلام قادر فیضی
مارکیٹنگ منیجر	محمد اسرائیل فیضی
تزئین کار	کوثر سمنانی
تزئین کار	منظر سبحانی
آپریٹر	محمد نعیم
کاتب	محمد شفیق فیضی
کاتب	عبد المجید فیضی
کمپوزنگ	جام نور کمپیوٹرز

فی شمارہ	15/=
زر سالانہ	170/=
قیمت پاکستان میں	20/=
بیرون ملک (ہوائی ڈاک)	$ 30 امریکی ڈالر £ 20 پونڈ
لائف ممبر شپ (اندرون ملک)	5000/=
لائف ممبر شپ (بیرون ملک)	$ 300 امریکی ڈالر

مراسلت وترسیل زر کا پتہ

ملت کا ترجمان
ماہنامہ جام نور
۴۲۲ مٹیا محل جامع مسجد دہلی
Tele Fax: 011 23281418

MILLAT KA TARJAMAN
JAAM-E-NOOR Monthly
422 Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi - 6
Ph : (Off) 011- 23281418, 9313783691
E-mail: jnoormonthly@yahoo.com
E-mail: k_noorani@yahoo.com
website: www.jaamenoor.com

قانونی آگاہی کسی بھی قسم کی قانونی اور عدالتی چارہ جوئی صرف دہلی کی عدالت میں قابل سماعت ہوگی (ادارہ)

ڈرافٹ MILLAT KA TARJAMAN JAAM-E-NOOR Monthly پر صرف لکھیں

پرنٹر و پبلیشر، پروپرائٹر غلام ربانی نے اسلام آفسیٹ پرنٹنگ پریس 2229/A احاطہ کالے صاحب، سوئیوالان، دہلی سے طبع کرا کر آفس "ماہنامہ ملت کا ترجمان جام نور" 422 مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی ۔ ۶ سے شائع کیا

مشمولات

اداریہ	انقلاب ۱۸۵۷ء کے حقیقی داعی	خوشتر نورانی	(3)
پس منظر	انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسباب اور نتائج	مولانا سجاد عالم رضوی	(8)
حالات حاضرہ	انقلاب ۱۸۵۷ء اور عصری تصورات	ذیشان احمد مصباحی	(13)
شخصیات اسلام	مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی	مولانا اسید الحق عاصم قادری	(18)
تحریری مباحثہ	انقلاب ۱۸۵۷ء ناکام کیوں ہوگیا؟	علماء و دانشوران	(22)
فکر و نظر	اظہار خیالات	قارئین کے تبصرے	(27)
دینی مسائل	انقلاب ۱۸۵۷ء کی شرعی حیثیت	مفتی آل مصطفیٰ مصباحی	(33)
روبرو	پروفیسر عزیز الدین اور مولانا لیٰسین اختر مصباحی سے ملاقات	(ادارہ)	(36)
جہان ادب	انقلاب ۱۸۵۷ء میں اردو زبان کا کردار	ڈاکٹر خواجہ اکرام	(43)
دیوان عام	علماء و قائدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء	مولانا لیٰسین اختر مصباحی	(48)
خزینۂ معرفت	۱۸۵۷ء کی دردناک داستان	مولانا منظر الاسلام ازہری	(56)
پیمائش	کتاب: انگریز نوازی کی حقیقت	نیاز احمد مصباحی	(58)
خبریں	ملی، ادبی، سیاسی اور مذہبی سرگرمیاں	(ادارہ)	(62)

مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں۔

اداریہ

خوشتر نورانی

انقلاب ۱۸۵۷ء کے حقیقی داعی

جو آج اقتصادی بدحالی سے دوچار ہیں اور جن کی وطن کے تئیں وفاداریوں کو مشکوک قرار دے دیا گیا ہے

ایک انگریزی مورخ نے کبھی کہا تھا کہ ''کسی واقعہ کو زیادہ عرصے تک حافظہ میں محفوظ رکھنے کی صلاحیت مشرقی دماغ کو فطرۃً کسی قدر زیادہ نصیب ہوئی ہے۔'' لیکن ۱۸۵۷ء جیسے اہم اور عظیم انقلاب کے حوالے سے ہندوستانیوں کی یادداشت کو دیکھ کر مذکورہ قول کی صداقت کا یقین نہیں آتا۔ ۲۰۰۷ء میں انقلاب ۱۸۵۷ء کو برپا ہوئے ڈیڑھ سو سال پورے ہو گئے، اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج تک انقلاب کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہندوستان میں اس کی مستند، مربوط اور مکمل تاریخ نہیں لکھی جا سکی ہے، جبکہ دنیا کی معلوم تاریخ میں صرف آزادی کی جدوجہد کی پاداش میں انسانی لاشوں سے کنویں بھرنے، توپوں سے اڑانے اور زندہ جلانے کی مثال اگر کہیں ملے گی تو اسی ۱۸۵۷ء کی معرکہ آرائی میں، لیکن ہندوستانیوں کے ذہن سے شاید برطانوی حیوانیت اور درندگی کے وہ ماہ و سال مٹ گئے جو ان کی سرد نبضوں کو حرارت پہنچاتی رہتی، غالباً اسی لیے نہ تو وہ اس المناک حادثے کی مربوط تاریخ لکھ کر نئی نسلوں کو روشناس کرا سکے اور نہ ہی ان حقیقی جانباز مجاہدین کو یاد رکھ سکے، جن کے جرأت مندانہ اقدام ہی ہماری آزادی کے باعث بنے۔ اس کے برعکس مغربی مؤرخین نے اس حادثے کے تعلق سے جو واقعات اپنی کتابوں میں لکھے ہیں وہ بالکل افسانوی اور فرضی نوعیت کے تھے، جن میں انہوں نے اپنی مظلومیت اور ہندوستانیوں کے ظلم و جبر کو دنیا کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں اس حوالے سے جو تاریخیں لکھی بھی گئیں تو ان میں سیاسی اور قومی رنگ غالب رہا، چنانچہ ہندوستانی مؤرخین جو اکثریتی فرقے سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے مسلمانوں کو بالعموم اور علما کو بالخصوص آزادی کی اس پہلی انقلابی جنگ سے غائب کر دیا یا ان کے کارناموں اور قربانیوں کو نہایت کم کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا، حالانکہ انگریزی حکومت اور مغربی مؤرخین کا اعتراف اور لائبریریوں میں محفوظ وہ سینکڑوں سرکاری و غیر سرکاری دستاویزات ہمیں بتاتے ہیں کہ اس انقلاب کے سب سے بڑے داعی اور محرک اگر کوئی ہے تو وہ مسلمان خصوصاً علما ہیں۔ اس جرم کے عوض انگریزی حکومت نے اس طرح انہیں سیاسی، سماجی، تعلیمی اور معاشی جہتوں سے مفلوج کیا ہے کہ وہ آج تک ہندوستان میں اکثریتی طبقے کے بالمقابل کھڑے نہیں ہو سکے ہیں، انگریزی حکومت کی ہندوؤں کے ساتھ مراعات اور مسلمانوں کے ساتھ یہی معاندانہ رویہ ہی آگے چل کر بالواسطہ تقسیم ہند کی بنیاد بن گیا۔

۱۰ مئی ۲۰۰۷ء کے ایڈیشن میں ٹائمز آف انڈیا (دہلی) نے ۱۸۵۷ء کے تعلق سے پہلے صفحے پر اس بات کا کھل کر اعتراف کیا ہے کہ:

The main targets of the suppression were the muslim ulema, weavers and peasants, since the British blamed them for being the masterminds behind the revolt (ظلم و بربریت کا جنہیں نشانہ بنایا گیا ان میں مسلم علما، بنکر اور کسان سرفہرست تھے، کیونکہ برطانوی حکومت نے بغاوت کے پیچھے ان ہی لوگوں کے بنیادی کردار ہونے کا الزام عائد کیا تھا) انگریزی سرکار کا یہ الزام غلط بھی نہیں تھا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل مسلمانوں کی حالت ۔ ۷۱۲ء میں سندھ میں محمد بن قاسم کے حملے سے ۹۰؍سال قبل ہی ہندوستان میں اسلام پھیل چکا تھا، محمد بن قاسم کے حملے کے بعد مسلمانوں نے رفتہ رفتہ ہندوستان میں کافی قوت حاصل کر لی، مسلمانوں کی یکے بعد دیگرے فتوحات نے ہندوستانی تاریخ کو کافی متاثر کیا، اسی طرح ان کی تہذیب و ثقافت نے ایک نئے سماج کی تشکیل دی۔ مسلمانوں نے اپنی تعلیم اور فکر و فن سے اس کی رگوں میں برقی لہر دوڑا دی۔ عہد سلطنت ۱۲۰۶ء سے لے کر مغلیہ سلطنت کے زوال کی شروعات جنگ پلاسی کے اختتام کے بعد ۱۲؍اگست ۱۷۶۵ء تک مسلمانوں کے عروج کا دور رہا ہے، مسلم سلطنت کے اس تقریباً سات سو سالہ دور میں مسلمانوں کے پاس اعلیٰ سرکاری مناصب تھے، بڑی بڑی ریاستیں ان کے زیر نگیں تھیں، عدلیہ اور انتظامیہ کے بڑے عہدے ان ہی کے پاس تھے، علما، فضلا، ادبا اور شعرا کا خاص مقام تھا، جنہیں ان کی اہلیت اور مناسبت سے اعزازات دیے جاتے تھے، اسی طرح تعلیمی امور بھی مسلمانوں کے ہی ہاتھوں میں تھا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال سے قبل مسلمان اپنے دینی امور اور مذہبی معاملات میں بڑے ہی متصلب تھے اور مسلم معاشرے پر علماء کی مضبوط گرفت تھی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی حکومت میں ہندو رعایا کے ساتھ کوئی قابل ذکر ظلم نہیں کیا، نہ ان کے مذہب کو تبدیل کرنے کی تحریک چلائی اور نہ اسلامی روایات ان پر مسلط کیں، حالانکہ مسلمان اس پوزیشن میں تھے کہ اپنی سات سو سالہ زریں تاریخ میں اپنی بے پناہ عسکری قوت سے اپنی عددی قوت کو اکثریت میں تبدیل کر سکتے تھے لیکن مسلمان اس وقت بھی اقلیت میں ہی تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر مسعود احمد (کراچی) نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ

"پاک و ہند کے مسلمان طبعاً روادار ہیں، روادار نہ ہوتے تو ایک ہزار برس کے طویل دور حکومت میں ہندو الگ حکومت قائم کرنے کی کوشش کرتے، کیونکہ وہ اکثریت میں تھے، مگر اکثریت کے باوجود ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی، جس سے مسلمانوں کی بے مثال رواداری کی تصدیق ہوتی ہے اور تاریخ کے اوراق اس حقیقت کی توثیق کرتے ہیں۔" (دو قومی نظریہ اور پاکستان، ص ۵ مطبوعہ ادارہ مظہر اسلام لاہور، پاکستان)

اس کے برخلاف برطانوی حکومت کے سو برس کے اندر ہی ۱۸۵۷ء میں ان کے خلاف ہندوستانیوں نے جنگ کا اعلان کر دیا اور دو سو برس کے اندر انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا، کیونکہ ہندوستانیوں کے ساتھ جس طرح حیوانیت کا انہوں نے مظاہرہ کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا۔

انگریزی تسلط کے بعد مسلمانوں کی حالت - ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۰ء میں ہندوستان تجارت کی غرض سے آئی اور پھر رفتہ رفتہ اپنی عیاری سے مختلف ریاستوں پر قابض ہو گئی۔ جنگ پلاسی کے اختتام کے بعد مغل شہنشاہ شاہ عالم نے ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو باضابطہ طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی کے تمام حقوق عطا کر دیے، جس کی وجہ سے کمپنی کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ سرکاری محاصل وصول کر سکے۔ اور پھر کمپنی کی طاقت مستحکم ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد بھی مسلمان اعلیٰ عہدوں پر تھے، سرکاری زبان فارسی ہی تھی، فوجداری مقدمات کے فیصلے بھی وہی کیا کرتے تھے اور بنگال کے عدلیے اور مالیے کا انتظام و انصرام بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ لیکن ۱۷۸۳ء میں لارڈ کارنوالس نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر کے دونوں کے علیحدہ علیحدہ عہدے دار متعین کیے اور ان دونوں شعبوں میں اعلیٰ مناصب انگریزوں کے لیے مختص کر دیے، ان تبدیلیوں کی وجہ سے مسلمانوں پر نہایت مضر اثرات مرتب ہوئے، کیوں کہ اس طرح بہت سے مسلم امراء کو بڑے عہدوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مسلم جاگیر داروں سے سرکاری محصول کی وصولیابی کا حق چھین لیا گیا اور مسلم نمائندین کی جگہ انگریز تعلقہ داروں (کلکٹروں) نے لے لی، پھر بندوبست Permanent Settlement کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے مسلمان اپنی زمینوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جنہیں ہندوؤں نے خریدنا شروع کر دیا، اس طرح بنگال میں ہندوؤں کی خوشحالی اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا آغاز ہو گیا۔ بنگال کے علاوہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں پر بھی سیاسی و سماجی تبدیلیوں نے مسلمانوں کو ہر میدان میں کافی متاثر کیا۔ انہی دنوں ایک اور قیامت مسلمانوں پر گزری، لارڈ ولیم بینٹنگ نے گورنر کے عہدے پر فائز ہوتے ہی زمین داروں کی ملکیت کے دستاویزات کی جانچ کا حکم دے دیا، اس کے لیے خصوصی عدالتیں بھی قائم کی گئیں، جو مسلمان بھی مغل عطیات کے تعلق سے اپنی ملکیت ثابت نہ کر سکا اسے اپنی زمین و جائیداد سے دست بردار ہونا پڑا، اس طرح ہزاروں لاکھوں مسلمان قلاش ہو گئے۔ ۱۸۳۷ء میں مسلمانوں پر ایک اور افتاد آ پڑی جب انگریزی حکومت نے فارسی زبان کو سرکاری زبان کے طور پر ترک کر کے اس کی جگہ انگریزی و دیگر صوبائی زبانوں میں سرکاری کام کاج شروع کر دیا، جس کی وجہ سے ہزاروں مسلمانوں کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ گیا، کیونکہ مسلمان نہ تو انگریزی سے واقف تھے اور نہ تیلگو، بنگالی، اڑیہ اور مراٹھی زبانوں سے، جب کہ ان زبانوں کا اچھا خاصا ارتقا انگریزی حکومت کے زیر سایہ ہو رہا تھا۔ پھر اسلامی ضابطۂ فوجداری کی جگہ تعزیرات ہند کے نفاذ نے تو رہی سہی مسلمانوں کی حالت کو بھی ختم کر ڈالا۔

مسلمانوں کی اس ابتر صورت حال کا ذکر پی۔ سی جوشی کی مرتب کردہ کتاب "انقلاب اٹھارہ سو ستاون" میں بھی ہے۔ معروف محقق تلمیذ خلدون قدیم دستاویزات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

"ادھر مذہبی اوقاف کی ضبطی نے قدیم مسلمان خاندانوں پر ناگوار اثر ڈالا اور انہیں مشتعل کر کے بغاوت پر آمادہ کیا، اُدھر جدید طریقہ تعلیم سے جس میں انگریزی زبان، مغربی ادب اور سائنس کو فوقیت حاصل تھی، روشن خیال مسلم طبقہ کی وقعت خاک میں مل گئی۔ کے (Keye) اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ "ہمارے تعلیمی اقدامات اور ہمہ گیر انگریزیت جس سے ملک کو خطرہ درپیش تھا، شان مسلمانی کو گھٹاتے اور اس منصب دین کے بہت

سے بارسوخ لوگوں کو ان کی آمدنی سے محروم کرنے کا موجب ہوئے"۔ عدالتوں میں فارسی زبان کے ترک سے اور سرکاری ملازمت میں امتحان کی بنا پر بھرتی سے مسلمانوں کے لیے سرکاری نوکری کے مواقع اگر یکسر مٹے نہیں تو کمتر ضرور ہو گئے۔" (ص: ۲۹، مطبوعہ قومی کونسل دہلی)

ان حالات میں مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی چنگاری کا اندر ہی اندر سلگنا فطری تھا۔ انگریزی حکومت کا مسلمانوں کے ساتھ سوتیلا رویہ صرف اس لیے تھا کہ وہ اپنے مذہبی اور شرعی امور میں کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رویہ محکومانہ نہیں تھا، جس کی وجہ سے انگریزی حکومت کے اعلیٰ عہدیداران محسوس کرتے تھے کہ مسلمان ان کی حکومت اور مذہب کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں، پھر یہ کہ انگریزوں کے خلاف ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۷۹۹ء کی جنگ میسور کی قیادت بھی مسلمانوں نے ہی کی تھی۔

اس کے برعکس ہندوؤں کے ساتھ حکومت کا رویہ رحم دلانہ تھا، کیونکہ وہ حکومت کے ہر جائز و ناجائز حکم پر سر جھکا دیتے تھے خواہ وہ مذہبی معاملات میں سمجھوتے کی بات ہو، انگریزی زبان کو قبول کرنے کا مسئلہ ہو یا پھر ان کی ناجائز مگلوی کی بات۔ انگریزی حکومت جانتی تھی کہ مذہبی بنیادوں پر عوام سے حکمرانوں کا اختلاف حکومتی امور کی انجام دہی میں کافی مشکل ہوگا، اس لیے انہوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے اپنے ادارے کھولنے شروع کیے تاکہ لوگ عیسائیت قبول کریں اور بڑے پیمانہ پر انگریزی تعلیم کے لیے گاؤں گاؤں میں اسکول کھولنے شروع کیے، ہندوؤں نے تو اسے آسانی سے اپنا لیا اور ترقی کرتے رہے مگر مسلمانوں نے ایسی کسی بھی تعلیم کو حاصل کرنے سے انکار کر دیا جس کی بنیاد مغربیت پر ہو، کیونکہ وہ حکومت کا منشا خوب اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ اس صورت حال کا نقشہ علامہ فضل حق خیرآبادی (وفات ۱۸۶۱ء) نے یوں کھینچا ہے۔

"انہوں (انگریزی حکومت) نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا، اس لیے پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب و ملت کو مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا، انہوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے، پچھلے زمانے کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی"۔ (باغی ہندوستان ص: ۳۱، مطبوعہ المجمع الاسلامی، مبارک پور)

آگے فرماتے ہیں کہ "ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے، مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف و پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکام دین مبین کو مٹانا وغیرہ ذالک"۔ (ایضاً)

مسلمانوں کے تعلق سے انتہا پسندانہ نظریات:۔ سلطنت مغلیہ کے عملی زوال کے بعد مسلمان جس طرح انگریزی حکومت کی سازش کا شکار ہوئے اس نے ان کے اندر انگریزوں کے خلاف نفرت و کراہیت کے جذبے کو تیز تر کر دیا، اسی جذبے کے تحت مسلم علما، قائدین اور عمائدین نے انگریزی سرکار کے خلاف منصوبے تیار کرنے شروع کر دیے تاکہ انہیں ملک سے باہر نکال کر آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں۔ مسلم علماء اور قائدین کے اس خفیہ منصوبے کی اطلاع انہیں ملتی رہتی تھیں اور وہ مسلمانوں کو ہی اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے، اس لیے مسلمانوں کو ملک میں بے دست و پا کرنے کے لیے انہوں نے مختلف اسکیموں اور منصوبوں پر عمل کرنا شروع کر دیا، ان کا ہر منصوبہ مسلمانوں کی بربادی کو لے کر سامنے آتا۔ تاریخ میں مسلمانوں کے تعلق سے ان کے انتہا پسندانہ نظریات کا اظہار ان کے خطوط، مضامین اور احکام سے ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے تعلق سے انگریزی سرکار کی بیزاری کا رجحان ۱۸۴۲ء میں اس وقت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا جب لارڈ ایلن برو Lord Ellen Borough نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ موصوف گورنر ہندوؤں کے لیے اپنے دل میں خاص گوشہ رکھتے تھے جب کہ مسلمانوں سے انہیں نفرت کی حد تک دشمنی تھی، جس کا اظہار انہوں نے کئی موقعوں پر کیا۔ ایک مرتبہ ہندو دوستی میں انہوں نے محمود غزنوی کے ہاتھوں تاراج کیے ہوئے سومنات مندر کے دروازوں کی تجدید کے موقع پر ہندو راجاؤں اور رہنماؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

"آج بالآخر آٹھ سو سالہ پرانی بے عزتی کا بدلہ لے لیا گیا" موصوف کی یہ دیرینہ خواہش بھی تھی کہ مغل شہنشاہ اور ان کا خاندان شاہی محل کو خالی کر دیں اور ان کے تمام القاب و خطابات اور مراعات واپس لے لیے جائیں تاکہ یہ ساری چیزیں ملکۂ برطانیہ کے نام سے منسوب ہو سکیں، اس نے ہندو مسلم کے مابین توازن رکھنے کے لیے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ "مسلمانوں کا دماغ درست کیا جائے" (پس منظر ۱۸۵۷ء، ص: ۲۱)

گورنر جنرل کی حیثیت سے اس کے لیے اپنے تمام تر انتہا پسندانہ نظریات کو عملی جامہ پہنانا آسان بھی تھا، اس لیے اس نے اپنے عہد گورنری میں مسلمانوں پر کافی ظلم ڈھائے۔ اسی طرح لارڈ ڈلہوزی کا سلوک بھی مسلمانوں کے ساتھ کافی معاندانہ رہا، جب کہ برطانوی حکومت کے نظم ونسق کے سلسلے میں اسی کا اہم اور فیصلہ کن کردار رہا ہے۔ ۱۸/اگست ۱۸۵۳ء کو اس نے اپنے ایک دوست کو ذاتی نوعیت کا خط لکھا جس کے ذیل کے اقتباس سے مسلمانوں کے تعلق سے اس کی مخصوص ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

”اودھ کا بادشاہ خرد ماغی کی جانب مائل نظر آتا ہے، میں چاہتا بھی یہی ہوں کہ ایسا ہی ہو، اپنی روانگی سے پہلے اسے ہضم کر پانا میرے لیے بڑی طمانیت کا باعث ہوگا۔ دلی کا بوڑھا بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) اپنی موت آپ مر رہا ہے، اگر کورٹ آف ڈائرکٹرس کی فرسودہ حماقت آڑے نہ آتی تو میں کبھی کا اس کھوسٹ کے ساتھ ہی خاندان تیمور کا خاتمہ کر چکا ہوتا“۔ (ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج ص ۲۱)

انقلاب ۱۸۵۷ء کے فوری بعد جنرل رسل نے بھی لندن کے اخبار ”دی ٹائمز“ کو جو خط لکھا ہے، اس میں مسلمانوں کے تعلق سے اس نے جس گندی ذہنیت کا ثبوت دیا ہے وہ تمام ہندوستانیوں کے لیے دیدۂ عبرت نگاہ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”ہمیں شمع محمدی کے پروانوں کے ساتھ جو معاندت ہے وہ اس مخاصمت کے مقابلے میں زیادہ شدید ہے جو ہم شیو Shiva اور وشنو کے پرستاروں کے ساتھ رکھتے ہیں، مسلمان ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں، اگر ہم بیک جنبش محمد کی حدیثوں اور معبدوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ بات عیسائی مذہب اور برطانوی حکومت دونوں کے لیے فال نیک ثابت ہوگی“۔ (ایضاً، ص ۲۳)

انگریزی حکومت کے یہ تین مخصوص اور اعلیٰ عہدے داروں کی ذہنیت سے حکومت کا مسلمانوں کے تعلق سے نفرت آمیز نظریہ واضح ہو جاتا ہے، انقلاب ۱۸۵۷ء کے تعلق سے اگر کتابیں کھنگالی جائیں تو مسلمانوں کے حوالے سے نفرت وتعصب پر مبنی بے شمار واقعات اور اقوال سامنے آتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان نفرتوں کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمان انگریزی حکومت سے کسی قیمت پر بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے حقیقی داعی اور محرک:- انگریزی حکومت کے ہندوستان میں تسلط کے بعد سے ہی مسلمان ان کے خلاف برسرپیکار تھے اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے سو برس بعد بھی ان کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں بغاوت کی چنگاری سرد نہیں پڑی تھی، گو کہ جنگ پلاسی اور جنگ میسور میں، جن کی قیادت دو غیور مسلمان کر رہے تھے، ہندوستانیوں کو شکست ہوئی، لیکن مسلمانوں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ان کی عظمت رفتہ کی بحالی کی آخری کوشش ہے، اس لیے انہوں نے اس جنگ میں پورے جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا اور اس کی کامیابی کے لیے اپنے لاکھوں افراد جن میں بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھیں بے دریغ جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ مشہور مغربی مصنف رسلمین نے اس وقت جب ہندوستان کا دورہ کیا تو وہ جہاں کہیں بھی گیا مسلمانوں میں احساس آزادی کی شدت کو اچھی طرح محسوس کیا، انقلاب کے بعد جب اس نے اپنے مشاہدات کو قلم بند کیا تو یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ

”۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں نے اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بازیافت کی بھرپور کوشش کی لیکن اس بار انہوں نے بالکل ہی مختلف قسم کے حالات میں ایک انوکھا کردار نبھانے کی کوشش کی“ (ایضاً، ص ۱۹)

۱۸۵۷ء میں انگریزی سرکار کے خلاف مسلمانوں کی صرف بغاوت نہیں تھی بلکہ ملک کو آزاد کرا کر اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بازیافت کی آخری جان توڑ کوشش تھی، اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ تھی، لیکن ان میں قیادت اور تنظیم وتربیت کا فقدان تھا، بیشتر مسلمان قلاش ہو چکے تھے اور مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز ان کا شہنشاہ ضعیفی اور بے بسی کی زندگی گزار رہا تھا، اس کے باوجود ان کی طاقتیں کمزور نہیں پڑی تھیں اور وہ اس جنگ کی قیادت کر رہے تھے، سر جارج کیمبل نے اس انقلاب کے بعد لندن کے اخبار ”دی ٹائمز“ کو ایک خط لکھا اور اس بات کا اظہار کیا کہ: ”سب سے واضح مقبول اور شدید نظریہ یہ ہے کہ بغاوت مسلمانوں نے کی تھی“ (ایضاً، ص: ۲۳)

۱۰/مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں بغاوت سے عین قبل چپاتیوں کی تقسیم کی گئی جو انقلاب کے لیے تیار ہونے کا اشارہ تھا، اس چپاتی مہم کا آغاز بھی مسلمانوں نے کیا، کیونکہ چپاتی کے ساتھ گوشت کا ٹکڑا بھی تھا، ظاہر ہے کہ یہ کام مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا، اس سلسلے میں کرنل جی بی

مالیسن نے کہا کہ "فیض آباد کا مولوی احمد اللہ شاہ یقیناً سازش کا ایک لیڈر تھا"

کیو براؤن کا بیان ہے کہ "پنجاب سرکار نے شروع ہی سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ بغاوت کا آغاز دراصل ہندوستانیوں اور مسلمانوں کی طرف سے ہوا"۔ گبنس، براؤن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "مسلمانوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ہندوؤں کو خوف زدہ کر کے اپنا الو سیدھا کیا"۔۔۔۔ جس فوجی کمیشن نے بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی سماعت کی اس کے ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل میجر ایف۔ جے ہیرئٹ کا بیان ہے کہ

"ان مقدمات کی انتہائی معنی خیز حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی ہم نے تفتیش کی ہے مسلمانوں کی سازش کے آثار پائے ہیں، لیکن ایک بھی ایسی دستاویز ہاتھ نہیں لگی جس سے ظاہر ہو کہ ہندو بحیثیت فرقے کے ہمارے خلاف سازش کرتے رہے ہیں یا برہمنوں اور پجاریوں نے عیسائیوں کے خلاف جہادی پرچار کیا ہو"۔ (پی۔ سی۔ جوشی، انقلاب اٹھارہ سو ستاون، ص۔ ۳۵/۳۶)

انگریزی حکومت کے یہ تمام مذکورہ اعلیٰ عہدیداروں نے مسلمانوں کے تعلق سے جو بیانات دیے ہیں، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے حقیقی داعی اور محرک مسلمان ہی تھے، جن کی قیادت میں ہندوستان کے ہندوؤں نے بھی اس جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جو جنگ ۱۹۴۷ء کی آزادی کی بنیاد بن گئی۔

مسلمانوں کے لیے انگریزوں کا آخری تحفہ:۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی ہندوستانی قومیت کے جذبے کے تحت کامیابی سے ہم کنار ہوئی، اس جنگ میں ہندوستانی خواہ جس مذہب کے ہوں، صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ چونکہ تقریباً اس حقیقت سے تمام دانش ور اور مورخ اتفاق کرتے ہیں کہ یہ آزادی بھی پہلی جدوجہد آزادی ۱۸۵۷ء کا ہی نتیجہ تھی، جس کے حقیقی داعی اور محرک مسلمان تھے، اس لیے انگریز ملک سے جاتے جاتے نہ صرف "تقسیم وطن" کا زخم دے گئے، بلکہ ہندوؤں کو ہمیشہ کے لیے اقتصادی اور سماجی طور پر مستحکم کر گئے اور مسلمانوں کو بے دست دیا، مسلمانوں کے لیے یہ زخم اب ناسور بن چکا ہے، جس کی تکلیف سے وہ اب تک کراہ رہے ہیں۔ تمیز خلدون تاریخی دستاویز کے حوالے سے "انقلاب اٹھارہ سو ستاون" میں مذکورہ بات کی یوں تصدیق کرتے ہیں۔

"(انگریزی دور میں) سرکار کے تمام انتظامیہ اداروں میں مسلمانوں کا تناسب گھٹ کر چار پانچ فی صدی رہ گیا، جب کہ سو سال پہلے انہیں حکومت کی اجارہ داری حاصل تھی۔ یہی حال ان اعلیٰ اسامیوں کا ہے جہاں سرکار کے لطف و کرم کی تقسیم پر ہر وقت کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے، کم حیثیت کے عہدوں سے مسلمانوں کا اخراج اور بھی زیادہ ہے ہندو تعلیم کے میدان میں بہت آگے بڑھ چکے تھے اور سرکاری ملازمتوں اور تجارت میں اپنے قدم جما چکے تھے دونوں فرقوں کی غیر مساوی ترقی سے ہندو مسلم مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اسی مسئلہ نے بعد میں ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد میں رخنہ ڈالا۔ انگریزوں نے اس مسئلے کو ہوا دی اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بالآخر یہ پاکستان کے قیام کا موجب ہوا۔" (ص ۲۳)

اسی کے ساتھ ہی انگریزوں کی سازشوں اور آر۔ ایس۔ ایس اینڈ کمپنی کی شعوری کوششوں سے مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا گیا کہ اس تقسیم کے حقیقی ذمہ دار وہی ہیں۔ نتیجۃً مسلمان احساس گناہ سے بوجھل ہو گئے اور آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آزادی ہند کے حقیقی داعیوں کو اس طرح "غدار وطن" کے روپ میں کھڑا کر دیا گیا ہے کہ انہیں صفائی دینی مشکل ہو گئی ہے۔ دوسری طرف انگریزوں کی اقتصادی مار اور آزادی کے بعد حکومتی مناصب پر براجمان فرقہ پرست ہندوؤں کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں کی اقتصادی پوزیشن سچر کمیٹی کی حالیہ رپورٹ کے مطابق یہ بن چکی ہے۔

"مختلف ریاستوں کے مسلمانوں کے حالات میں (اور ان مسلمانوں کے حالات میں جو اپنے آپ کو او۔ بی۔ سی اور دیگر زمروں میں شمار کرتے ہیں) قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے اور یہ کہ مسلم فرقہ ترقی کے عملاً تمام مظاہر میں خسارے اور محرومیوں سے دوچار ہے۔ درحقیقت زیر غور تمام اشاریوں کے لحاظ سے مسلمانوں کی حالت کم و بیش ایس۔ سی/ایس۔ ٹی سے کچھ بہتر، مگر ہندو او۔ بی۔ سی، دیگر اقلیتوں اور عام ہندوؤں (بیشتر اعلیٰ ذات والے) سے بدتر ہے"۔ (سچر کمیٹی رپورٹ، ۱۲واں باب، بحوالہ سی۔ پی۔ آئی کی نظر میں بھارت کے مسلمان، صفحہ ۵۸)

اب حال یہ ہے کہ آزادی کے علمبرداروں کے لیے اقتصادی طور پر باوقار زندگی گزارنا بھی مشکل ہے اور اپنے اوپر لگائے گئے "غداری" اور "بے وفائی" کے الزامات کی صفائی دینا بھی مشکل ہے۔ آج ہر مسلمان زبان حال سے گنگنا رہا ہے کہ "بات کرنی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی"۔ ☆

مولانا سجاد عالم رضوی☆

انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسباب اور نتائج

تاریخ نگاری:-- انقلاب 1857ء کے سلسلے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ ایک ایسا وقتی اور فوری واقعہ تھا جس کی پہلے سے کوئی منصوبہ بندی نہ کی گئی ہو یا یہ ایک باقاعدہ یا خفیہ تنظیم کا نتیجہ تھی۔ اس انقلاب کے سلسلے میں ایک تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس کے مطالعے کے لیے تقریباً پوری طرح صرف یورپی مآخذ پر ہی تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ انقلابیوں نے اس ضمن میں کوئی ریکارڈس نہیں چھوڑے یا انہوں نے ریکارڈس رکھے تھے مگر وہ خفیہ تھے اور مؤرخوں نے ان کی تلاش وجستجو کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسی لیے کچھ مصنفین اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ اس بغاوت کے پیچھے کوئی باقاعدہ منصوبہ تھا۔ مصنفوں اور مؤرخوں کے ایک گروہ کا اصرار ہے کہ یہ بغاوت ایک دور تک پھیلی ہوئی اور بڑی منظم سازش کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنی بات کی تصدیق کے طور پر روٹیوں اور کنول کے لال پھولوں کی تقسیم، گاؤں گاؤں بھٹکنے اور پروپیگنڈہ کرنے والے سنیاسیوں اور فقیروں اور مداریوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلابیوں کے ریکارڈس تھے مگر وہ ہندوستانی زبانوں میں تھے۔ ہمارے مؤرخین دستاویزات، مسودوں، روزنامچوں، آپ بیتیوں وغیرہ کو چھان پھٹک کر کے اس انقلاب کے ہندوستانی پہلو کو تلاش نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے جو نتیجہ وہ اخذ کرتے ہیں وہ مکمل اور جامع نہیں ہوتا۔

ہندوستان کی جدید تاریخ نویسی کے رجحانات کی جھلک انقلاب 1857ء کے مطالعہ میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ مؤرخ اس انقلاب کے اسباب کی کھوج میں ان اصولوں پر کاربند ہوتا ہے جن کی طرف اس کا فکری جھکاؤ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس انقلاب کی نوعیت کے سلسلے میں بھی مؤرخوں کے درمیان کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کوئی اسے صرف فوجی بغاوت کہتا ہے تو کوئی اسے ہندوستان کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ کوئی اسے جنگ آزادی کی قومی جد وجہد قرار دیتا ہے تو کوئی اس کو جاگیردارانہ طبقہ کی بے چینی اور اس کے رد عمل کا اظہار کہتا ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اسے مذہبی جنگ قرار دیتے ہیں۔ ان مختلف اقوال کے در پردہ تاریخ نگاری کے نظریات اور رجحانات کی جلوہ گری ہے۔

بغاوت کے اسباب:-- جس طرح بغاوت کی نوعیت کے سلسلے میں مؤرخوں کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے اسی طرح بغاوت کے حقیقی اسباب کے سلسلے میں بھی اختلاف ہے۔ برطانوی اور ہندوستانی مؤرخوں نے فوجی شکایات اور چربی والے کارتوسوں کی اہمیت پر حد سے زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن جدید تحقیق نے اس حقیقت کو پوری طرح سے واضح کر دیا ہے کہ "چربی والے کارتوس" واحد سبب نہیں تھے۔ اور نہ ہی وہ بہت زیادہ اہم تھے۔ اس کے برعکس متعدد (سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی) اسباب تھے جنہوں نے اس بغاوت کو جنم دیا۔

سیاسی اسباب:-- الحاق کی برطانوی پالیسی نے ملک میں سیاسی توازن کو متاثر کیا تھا۔ 1857 میں لارڈ ڈلہوزی نے اودھ کا بھی الحاق کر لیا۔ اس اقدام نے کمپنیوں کے سپاہیوں میں غصے کی آگ بھڑکا دی۔ ان میں 75 ہزار خود اودھ کے تھے۔ ان سپاہیوں میں قومیت کا کل بنو جذبہ نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے ہندوستان کے باقی علاقوں کو فتح کرنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی۔ لیکن مقامی وطن دوستی کا جذبہ تو ان کے دلوں میں تھا۔ انھیں زمین کا لگان بھی دینا ہوتا تھا۔ اشیائے خوردنی، مکانوں، کشتیوں اور افیون پر بھی محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ ہزاروں اشراف، امراء اور افسران بے روزگار ہو گئے۔ اسی لیے وہ انگریز سرکار کے سب سے خطرناک دشمن بن گئے۔ ڈلہوزی کے ہاتھوں اور دوسری متعدد ریاستوں کے ساتھ ساتھ جب اودھ کا الحاق بھی ہوا تو مقامی ریاستوں کے حکمرانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اب انہیں احساس ہوا کہ ان کی ذلت آمیز وفاداری بھی زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ جمانے کی انگریزوں کی حرص وطمع میں کمی نہیں کر سکتی تھی۔ جس بات سے انگریز حکمرانوں کے سیاسی اقتدار کو دھکا پہنچا وہ یہ تھی کہ وہ ہندوستانی حکمرانوں سے کئے ہوئے تمام زبانی وتحریری وعدے اور عہد ایک ایک کر کے توڑ

☆Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia 22,Zakir Nagar Okhla, New Delhi-25

دیتے تھے یا ان کی ریاستوں کو اپنی حکومت میں شامل کر رہے تھے یا ان کی حیثیت ماتحتوں سے بھی بدتر بنا رہے تھے، ان کی ریاستوں کے لیے زبردستی اپنی مرضی کے جانشیں منتخب کر رہے تھے۔ زبردستی شمولیت اور محکومی کی اس پالیسی نے بہتوں کو انگریزوں کا جانی دشمن بنا دیا۔

معاشی اسباب۔ ہندوستانی ریاستوں کے الحاق نے حیرت ناک معاشی وسماجی نتائج کو جنم دیا۔ نہ صرف یہ کہ ہندوستانی اشرافیہ کو پوزیشن اور اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ بلکہ تمام اعلیٰ عہدے یورپیوں کے لیے مخصوص تھے۔ نسلی امتیاز یا نسل پرستی کے واقعات نمایاں تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامی مشینری ناقص اور ناکافی تھی۔ زمین کے لگان کی پالیسی سے لوگ بہت ہی بدظن تھے۔ بہت سے تعلقہ دار اپنے عہدوں اور ذرائع آمدنی سے محروم ہوگئے۔ بڑی بڑی جائدادوں کو ضبط کر کے نیلام کر دیا گیا۔ اس طرح سے انگریزوں کی زمین کے لگان کی پالیسی، عدلیہ اور نظم ونسق کے نظام کے اثرات کے علاوہ سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ بہت سے چھوٹے موٹے زمینداروں پر زمین کے لگان کا ایسا بے تحاشہ بوجھ پڑا کہ ان میں سے اکثر قرض میں بندھ گئے اور ان کی زمینوں پر ساہوکاروں اور تاجروں کا قبضہ ہوتا چلا گیا۔ بہت سے زمینداروں کو لگان کے بے اندازہ بڑھتے ہوئے مطالبوں کی وجہ سے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان کے سروں پر ہر وقت زمینداری اور دیگر حقوق چھن جانے اور اسی طرح گاؤں میں عزت ووقار سے محروم ہو جانے کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اپنی محرومی پر ان کا غصہ اور بڑھ جاتا تھا۔

اس کے علاوہ نظم ونسق کی نچلی سطحوں پر بے حد بڑھتی ہوئی رشوت خوری کی وجہ سے عام لوگوں پر دوہری مار پڑ رہی تھی۔ پولیس، چھوٹے افسران اور نچلی عدالتیں تو رشوت خوری کے لیے بری طرح بدنام تھیں۔ بغاوت کی وجہ کے سلسلے میں برطانوی آفسر ولیم ایڈورڈس نے 1859 میں لکھا تھا کہ "پولیس لوگوں کے لیے ایک عذاب تھی اور ان کے ہاتھوں لوٹ مار، استحصال، نیز ان کے خلاف قانونی مطالبے ہماری سرکار کے لئے ہندوستانیوں کے غصے اور بے چینی کی اہم وجہ بن گئے۔" عدل وانصاف کے پیچیدہ نظام نے امیروں کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال آسان بنا دیا تھا۔ زمین کے لگان یا محصول کی ادائیگی میں کمی بیشی یا قرضے کے سود کی رقم وقت پر ادا نہ ہونے کی صورت میں کاشتکار کو مارنا، اذیتیں دینا اور جیل میں ڈال دینا عام بات تھی۔ مختصر یہ کہ عوام مسلسل بڑھتی ہوئی غربت سے پریشان ہو کر بے خطر آگ میں کھودنے کو تیار ہوگئے اور عام بغاوت میں شامل ہوتے چلے گئے۔

ہندوستانی سماج کے اعلیٰ اور درمیانی طبقے کے لوگوں اور خاص کر شمالی علاقوں کے لوگوں پر انتظامیہ میں اونچی تنخواہوں والی اعلیٰ ملازمتوں سے محروم ہو جانے کی وجہ سے دوہری مار پڑی تھی۔ جیسے جیسے ہندوستانی ریاستیں ختم ہوتی گئیں ویسے ویسے ہندوستانی جو کل تک ان ریاستوں میں نظم ونسق اور عدل وانصاف کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے روزی روٹی کھوتے چلے گئے اور برطانیہ کی برتری نے ان لوگوں کو بھی تباہ کر دیا جن کا ذریعہ معاش تہذیبی سرگرمیوں سے جڑا ہوا تھا۔ ہندوستانی حکمراں ہمیشہ سے فنون لطیفہ اور ادب کی سرپرستی کرتے چلے آئے تھے، یہ لوگ علما اور مذہبی مبلغوں اور دینی رہنماؤں کی بہت حمایت کرتے تھے۔ ان حکمرانوں کی جگہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج کیا آیا کہ یہ لوگ حکمرانوں کی سرپرستی سے محروم ہوگئے۔ جن لوگوں کا ذریعہ معاش یہی تھا وہ غربت کے شکار ہوگئے۔ مذہبی مبلغوں، پنڈتوں اور مولویوں نے دیکھا کہ ان کا مستقبل خطرے میں ہے۔ چنانچہ غیر ملکی سرکار کے خلاف عوام کے دلوں میں نفرت کا جذبہ جگانے میں ان لوگوں نے بھی بہت اہم رول ادا کیا۔

سماجی و مذہبی اسباب - انگریزی سرکار کی غیر مقبولیت کی ایک اور اہم وجہ تھی اس کا غیر ملکی ہونا، انگریز ہمیشہ ہی ہمارے ملک میں بدیشی رہا۔ انگریزوں اور ہندوستانی عوام کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ وہ پہلے کی فاتح قوموں کی طرح نہیں تھے۔ انہوں نے سماجی طور سے ہندوستانیوں کے اعلیٰ طبقے سے ربط پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں ہمیشہ اپنی سماجی برتری کا احساس رہتا تھا۔ سرسید احمد خاں نے بعد میں لکھا تھا "اعلیٰ عہدوں پر فائز دیسی بھی انگریز کے سامنے آتا تھا تو خوف سے لرزہ براندام آتا تھا۔" اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انگریز نہ ہندوستان میں بسنے آیا تھا نہ اسے اپنا گھر بنانے۔ اس کا تو بس یہ مقصد تھا کہ یہاں سے خوب دولت سمیٹے اور پھر یہ ساری دولت لے کر انگلستان لوٹ جائے۔ ہندوستان کی عوام کو نئے حکمرانوں کے اس بنیادی بدنیتی کردار کا پورا احساس تھا وہ کسی بھی صورت ان کو اپنا مربی اور بہی خواہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے بلکہ ان کے ہر قدم کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مختصر یہ کہ ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف ایک دھندلا اور بے نام سا جذبہ تھا جو 1857 کی بغاوت سے پہلے بھی انگریزوں کے

خلاف متعدد عوامی تحریکوں کے پرچم تلے سر اٹھاتا رہا تھا۔

ہندوستان کے عوام اس ڈر سے بھی برطانوی حکمرانوں کے خلاف ہو گئے تھے کہ ان کی موجودگی میں ہندوستانیوں کے مذاہب کو خطرہ تھا۔ اس خطرے کے وجہ بڑی حد تک ان مشنریوں (تبلیغی گروہ) کی سرگرمیاں تھی جو ہر جگہ نظر آتے تھے۔ اسکولوں میں، اسپتالوں میں، جیل خانوں میں، اور منڈی بازاروں میں یہ عیسائی مشنری لوگوں کو مذہب تبدیل کرنے پر اکساتے۔ ہندو دھرم اور اسلام پر کھلم کھلا عامیانہ اور غیر مہذب انداز سے حملے کرتے ا، ان پر کیچڑ اچھالتے۔ وہ ہندوستان کی ان تمام رسوم اور رواجوں کا کھلے عام مذاق اڑاتے اور ان کو برا بھلا کہتے جن پر ہندوستانیوں کو عرصہ سے بڑا ناز تھا۔ ان مشنریوں کو پولیس کی حفاظت حاصل تھی۔ برطانوی حکومت اور افسروں کے اکثر اقدامات عوام کے اس خیال کا بین ثبوت تھے کہ غیر ملکی سرکار ان مبلغوں کی حمایت کرتی ہے۔ کچھ لوگوں کے رجعت پسندانہ سماجی اور مذہبی جذبات کو ان اقدامات سے بھی چوٹ پہنچی جو حکومت نے ہندوستانی مصلحوں کے مشورہ پر انسان دوستی کے جذبے کے تحت اٹھائے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک اجنبی عیسائی سرکار کو ان کے مذہب اور رسوم میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ستی کے رواج کی ممانعت، بیوہ کی دوسری شادی کو قانوناً جائز قرار دینا اور مغربی تعلیم کے دروازے لڑکیوں کے کھولنا بھی ان کی نظر میں اس قسم کی دخل اندازی کے مظاہر تھے۔ مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اکثر انگریز افسران ان زمینوں پر بھی لگان لگانے کی پالیسی اپنا رہے تھے جو مندروں یا مسجدوں کے لیے وقف تھیں۔ یا مختلف سماجی فلاح و بہبود کے اداروں کے لیے وقف تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سے برہمن یا مسلم خاندان جن کا گزر بسر ان زمینوں پر تھا ان اقدامات سے بہت برگشتہ تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ انگریز ہندوستان کے مذاہب کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔

فوجی اسباب برطانوی فوج میں ہندوستانی سپاہیوں کے درمیان وسیع پیمانے پر بے چینی پائی جاتی تھی۔ ایک ہندوستانی سپاہی جرأت اور کارگزاری میں اپنے انگریز ہم عصر سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا۔ لیکن اس کی تنخواہ انگریز فوجی سے بہت کم تھی اور اس کے قیام و طعام کا انتظام بہت خراب تھا۔ اس کی ترقی کے امکانات بھی بہت کم تھے۔ ظاہر ہے ہندوستانی سپاہی احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ انگریز مورخ T-R-Holmes نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "وہ جانتا تھا کہ اس کی فوجی سوجھ بوجھ میں خواہ حیدر علی کی سی غیر معمولی صلاحیتوں کا پرتو ہی کیوں نہ ہو اسے کبھی ایک معمولی انگریز افسر جیسی تنخواہ بھی نہیں مل سکتی۔ اور تیس سال کی وفاداری اور خدمت گزاری کے بعد بھی اس کا عہدہ اور پوزیشن ایسی ہوگی کہ وہ انگلستان سے آئے ہوئے ایک معمولی نووارد علمبردار کے غرور اور تکبر اور حکم سے بچ نہیں سکے گا۔"

ہندوستانی سپاہیوں کی بے اطمینانی کی وجہ یہ بھی تھی کہ حال ہی میں یہ حکم صادر ہوا تھا کہ سندھ یا پنجاب میں ملازمت کے دوران ہندوستانی سپاہیوں کو بدیش سروس الاونس (بھتہ) نہیں دیا جائے گا۔ اس حکم کی وجہ سے زیادہ تر سپاہیوں کی تنخواہوں میں ایک دم بہت کمی آگئی۔ ان کے دیش یعنی اودھ کے الحاق نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

سپاہیوں کی بے اطمینانی کی دراصل ایک لمبی تاریخ ہے، بنگال میں تو 1764 کے اوائل میں ہی سپاہیوں کی ایک بغاوت نے سر اٹھایا تھا۔ حکام نے تیس سپاہیوں کو توپوں کے دھانوں سے اڑا دیا اور اس طرح اس بغاوت کا سر کچل دیا گیا۔ 1806 میں سپاہیوں نے ویلور میں بغاوت کی لیکن انتہائی ظالمانہ تشدد کے ساتھ اسے کچل دیا گیا۔ 1824 میں بیرک پور کے سپاہیوں کے 47ویں دستے نے سمندری راستے سے میانمار جانے سے انکار کر دیا۔ سزا کے طور پر سپاہیوں کو توپوں کا نشانہ بنایا گیا اور بغاوت کے لیڈروں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ 1844 میں تنخواہوں اور بھتوں کے سوال پر سات بٹالینوں نے بغاوت کر دی تھی۔ اسی طرح جنگ افغان کے دوران افغان میں جا کر لڑنے والے سپاہیوں میں بھی باغیانہ جذبات نے سر اٹھایا تھا۔ فوج میں بے اطمینانی کا مظاہرہ کرنے کے جرم میں ایک ہندو اور ایک مسلمان صوبے دار کو گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ فوج میں سپاہیوں کی بے چینی اور بے اطمینانی کا یہ عالم تھا کہ بنگال کے لفٹننٹ گورنر فریڈرک ہیلڈ نے 1858 میں کہا تھا کہ "بنگال کی فوج کم و بیش باغی ہو چکی ہے۔ ہر لمحہ بغاوت پر کمربستہ ہے اور وہ موقعہ ملتے ہی کسی نہ کسی وقت بغاوت پر آمادہ ہو جائے گی۔"

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد وجوہات اور اسباب کے باہمی تعامل نے اس انقلاب کی راہ ہموار کر دی تھی۔ صرف ایک چنگاری کی ضرورت تھی اور وہ میرٹھ میں سلگ اٹھی۔ اس انقلاب کی ابتداء میرٹھ میں 10 مئی 1857 کو ہوئی جہاں سپاہیوں کو چربی والے کارتوسوں کو

استعمال کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ انھوں نے ان کارتوسوں کو چھونے سے انکار کردیا۔ میرٹھ کے باغی فوجیوں نے دہلی کا رخ کیا۔ ضعیف العمر مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان کا حکمراں اعلان کیا گیا۔ دہلی میں بغاوت کی وقتی کامیابی نے شمالی اور مرکزی ہند کے کئی علاقوں میں جوش وخروش کی فضا پیدا کردی۔ اودھ، روہیل کھنڈ، مغربی بہار اور شمال مغربی صوبوں کے کئی شہروں میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس بغاوت میں کئی افراد نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ مگر 20 ستمبر 1857 کو برطانوی فوجیوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ قائم کرلیا۔ اور 1859 کے اختتام تک دیگر علاقوں کو بھی برطانوی حکومت کے ماتحت کرلیا گیا۔ اس وقت تک بغاوت یا انقلاب کے زیادہ تر قائدین یا تو وفات پاچکے تھے یا روپوش ہوچکے تھے۔

بغاوت کے اثرات:- اگرچہ 1857 کی بغاوت بظاہر ناکام رہی پھر بھی ہندوستان میں برطانوی حکمرانوں کے لئے یہ پہلا عظیم خطرہ تھا۔ بغاوت کے نتیجے میں رہنماؤں اور باغی ہندوستانی فوجیوں کو اپنی جانوں کی قیمت چکانی پڑی۔ ان کی آزادی سلب کرلی گئی۔ اور ان کی جائدادوں کو ضبط کرلیا گیا۔ فاتح انگریزی افواج نے ہندوستانی لوگوں پر مظالم ڈھائے اور ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا گیا۔ ہزاروں باغیوں کو اعلانیہ پھانسی دی گئی۔ سزا دیتے وقت ان کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کیا جاتا۔ باغی گاؤں اور شہروں کو پوری طرح سے تباہ و برباد کردیا گیا۔ ہندوستانی عوام اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان خلیج اور بڑھ گئی۔

ملکۂ برطانیہ کا اعلان:- 1857 کی بغاوت کے بعد ہندوستان میں برطانوی نظام حکومت میں کئی اہم اور بنیادی تبدیلیاں کی گئیں۔ حکومت کی باگ ڈور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر تاج برطانیہ کے ہاتھ میں آگئی۔ اب تک ہندوستان پر کمپنی کے ڈائریکٹروں اور کنٹرول بورڈ کی حکومت تھی۔ لیکن اب یہ طاقت اور اقتدار اسٹیٹ سکریٹری اور اس کی کاؤنسل کو سونپ دیا گیا۔ اسٹیٹ سکریٹری برطانیہ کی کابینہ کا ایک رکن ہوتا تھا اور اس حیثیت سے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ تھا۔ اس قانون کے تحت پہلے کی طرح اب بھی حکومت پر گورنر جنرل کی ذمہ داری تھی جسے وائسرائے یا تاج برطانیہ کہا جاتا تھا۔ پھر بعد میں 1861 کے انڈین کاؤنسل ایکٹ، 1861 کے انڈین ہائی کورٹ ایکٹ، اور 1861 کے انڈین سول سروسز ایکٹ کو پاس کرکے انتظامیہ، قانون ساز اداروں اور عدلیہ کے نظام میں کئی بنیادی تبدیلیاں کی گئیں۔ مرکزی اور صوبائی انتظام میں بھی کئی تبدیلیاں کی گئیں۔ ان اداروں میں ہندوستانی نمائندوں کو نامزد کیا جاتا تھا۔ مگر یہ نمائندگی برائے نام اور انگریز حکام کی صوابدید کے مطابق ہوتی تھی۔

فوج میں تبدیلیاں:- 1858ء کے بعد بہت سوچ سمجھ کر ہندوستانی فوج کی تنظیم نو کی گئی تاکہ اس قسم کی بغاوت دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔ فوج پر یوروپین دستوں کا کنٹرول زیادہ سے زیادہ بڑھایا گیا۔ فوج میں ہندوستانیوں کی سابقہ تعداد کے مقابلے میں یوروپین فوجوں کا تناسب بڑھا دیا گیا۔ جغرافیائی اور فوجی اعتبار سے یوروپی فوجوں کو مرکزی پوزیشن میں رکھا جاتا تھا۔ فوج کے اہم حصوں مثلاً توپ خانوں، ٹینک اور بکتر بند دستوں پر پوری طرح صرف یوروپین یونین افسروں کا تسلط تھا۔ 1914ء تک صورت حال یہ تھی کہ کوئی بھی ہندوستانی صوبے دار کے عہدے سے اوپر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ فوج کے ہندوستانی دستوں کی تنظیم کی بنیاد "لڑاؤ اور راج کرو" پر تھی تاکہ ہندوستانی سپاہی دوبارہ متحد ہوکر انگریز دشمن بغاوت کا پرچم بلند نہ کرسکے۔ فوج میں بھرتی کے سلسلے میں ذات، مذہب اور جغرافیائی علاقے کی بنیاد پر امتیاز برتنے کا رواج عام تھا۔ اسٹیٹ سکریٹری چارلس ووڈ نے 1861ء میں وائسرائے کیننگ کو لکھا تھا "میں آئندہ کبھی ایسی فوج کو دیکھنا نہیں چاہتا جو اپنے جذبات، تعصبات اور رشتوں اور ناطوں میں ایک جیسی ہو، جسے اپنی قوت پر بھروسہ ہو اور جس میں ایک ہوکر بغاوت کرنے کا رجحان ہو۔ اگر ایک رجمنٹ بغاوت کرے بھی تو میں چاہوں گا کہ دوسری رجمنٹ اس سے اتنی بے تعلق ہو کہ بخوشی اس پر گولی برسانے کو تیار ہوجائے۔"

پبلک سروسز:- حکومت ہند پر ہندوستانیوں کا اثر اور کنٹرول برائے نام تھا۔ انہیں نہ قانون کی تشکیل میں حصہ لینے کی اجازت تھی اور نہ ہی انتظامی پالیسیوں کے بنانے کا حق تھا۔ اس کے علاوہ انہی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے والی دفتر شاہی سے بھی الگ رکھا جاتا تھا۔ نظم ونسق میں ذمہ داری اور اقتدار کے سب عہدوں پر انڈین سول سروس والوں کا قبضہ تھا جن کا تقرر لندن میں منعقد ہونے والے ایک کھلے سالانہ امتحان کے ذریعے ہوتا تھا۔ اس امتحان کا طریقۂ کار کچھ ایسا تھا کہ اس میں کسی ہندوستانی کے لیے کامیابی تقریباً ناممکن سی ہوگئی تھی۔ نظم ونسق کے دوسرے شعبوں یعنی پولس، پبلک ورکس، صحت وعلاج، ڈاک، تار، جنگلات، انجینئرنگ، کسٹم اور بعد میں ریلوے میں اعلیٰ اور

برتر عہدوں پر صرف انگریز شہری رکھے جاتے تھے۔ یہ ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت ہوتا تھا۔ چنانچہ 1893ء میں اسٹیٹ سکریٹری لارڈ کیمبرلے نے لکھا تھا: ''سول سروس میں ایک معقول تعداد میں یوروپین شہریوں کا تقرر ہمیشہ ناگزیر رہے گا۔''

ریاستوں سے تعلقات: - بغاوت کی روشنی میں انگریزوں کو ہندوستانی ریاستوں سے متعلق اپنی پالیسی کو بالکل بدل دینا پڑا۔ پہلے وہ ان ریاستوں کا الحاق کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اب انہوں نے ان پالیسیوں کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔ بغاوت کے دوران زیادہ تر ہندوستانی رجواڑے انگریز حکومت کے وفادار رہے تھے۔ اب انعام کے طور پر اعلان کیا گیا کہ گود لینے کے ان کے حق کو تسلیم کیا جائیگا۔ ان کی علاقائی سالمیت کی ضمانت دی جائے گی۔ اس طرح سے ان ریاستوں کو لالچ دے کر انہیں ''طوفان روکنے کے لیے پشتے'' کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ان ریاستوں نے برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرلیا اور وہ سلطنت برطانیہ کے محکوم ایجنٹ کی حیثیت سے اپنی ریاستوں پر راج کررہے تھے۔

زمینداروں کے تئیں رویہ: - انگریزوں نے اب ہندوستان کے سب سے زیادہ رجعت پسند گروہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جس میں شہزادے، زمیندار اور جاگیردار شامل تھے۔ جس طرح انھوں نے شہزادوں کے ضمن میں اپنی پالیسی میں تبدیلی کی اور ابھرتی ہوئی عوامی اور قومی تحریکوں کے خلاف ان کو پشتہ بنانے کی کوشش کی اسی طرح سے اب انہوں نے زمین داروں اور جاگیرداروں کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ کسانوں کی بجائے زمین پر ان کی ملکیت کو تسلیم کیا گیا۔ اب انگریز ان کو قوم پرور دانشوروں کی توڑ کے طور پر استعمال کررہے تھے۔ وائسرائے لٹن نے 1876 میں اعلان کیا تھا کہ ''اب سلطنت برطانیہ کو چاہئے کہ ہندوستان کے طاقتور طبقۂ امراء کے مفادات، امیدوں، تمناؤں اور ہمدردیوں کے ساتھ ناطہ جوڑے۔'' دوسری طرف زمین داروں اور جاگیرداروں نے بھی تسلیم کیا کہ ان کی پوزیشن کا دارو مدار انگریزی راج پر ہے اور وہ اس کے زبردست حامی بن گئے۔

انتظامی پالیسیاں: بغاوت کے بعد ہندوستان کے سلسلے میں برطانیہ کا رویہ بھی بدلا۔ پہلے تو وہ ہندوستان کو جدید ڈھانچے میں ڈھالنے کی برائے نام کوشش بھی کرتے تھے لیکن اب تو وہ خوب سوچ سمجھ کر رجعت پسندی کی پالیسیوں پر عمل کررہے تھے۔ پہلے تو یہ کہا جارہا تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کی ٹریننگ کررہے ہیں تاکہ خود وہ اپنی سرکار چلانے کے اہل ہوجائیں، لیکن اب یہ نظریہ پیش کیا جارہا تھا کہ ہندوستانی سماج میں چھپی معاشرتی اور تہذیبی کمزوریوں کی وجہ سے ہندوستانی اپنے ملک پر راج کرنے کے اہل ہو ہی نہیں سکتے۔ اس رجعت پسندانہ پالیسی کا پرتو کئی میدانوں میں نظر آرہا تھا۔

لڑاؤ اور راج کرو: - انگریزوں نے ہندوستانی ریاستوں کے درمیان اتحاد کی کمی کا پورا فائدہ اٹھا کر ہندوستانیوں کو ایک دوسرے سے لڑوا کر اس ملک کو فتح کیا تھا۔ بغاوت کے بعد وہ لڑاؤ اور راج کرو کی پالیسی پر اور زیادہ شدت سے عمل پیرا رہے۔ انہوں نے شہزادوں اور نوابوں کو عوام کے خلاف بھڑکا کر، ریاست کو ریاست سے ٹکرا کر، ایک ذات والوں کو دوسری ذات والوں سے لڑوا کر اور سب سے بڑھ کر ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف صف آرا کر کے اس پالیسی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بغاوت کے دوران ہندو مسلم اتحاد نے غیر ملکی حکمرانوں کو پریشان کردیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے بغاوت کے فوراً بعد مسلمانوں کو خاص طور سے دبایا۔ بڑے پیمانے ان کی جاگیریں اور زمینیں ضبط کیں اور ہندوؤں کو اپنا خاص چہیتا ظاہر کیا۔ 1870 کے بعد یہ پالیسی بدل گئی۔ اب ان کی کوشش یہ تھی کہ اعلی طبقے اور درمیانی طبقے کے مسلمانوں کو آزادی کی تحریک کے خلاف اکسایا جائے۔ انگریزی سرکار نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں مذہبی نقطۂ نظر سے پھوٹ ڈلوانے کی خاطر نہایت چالاکی اور چابک دستی سے سرکاری ملازمتوں کی کشش اور لالچ کا بھی سہارا لیا۔ ان کے درمیان صوبائی اور مذہبی رقابتوں اور نفرت کی آگ بھڑکانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

تعلیم یافتہ ہندوستانیوں سے دشمنی کا رویہ: 1833ء کے بعد سے حکومت ہند نے جدید تعلیم کو پوری تندہی سے فروغ دینے کے اقدامات کیے تھے۔ متعدد انگریز افسروں نے اس بات کی بہت تعریف کی کہ بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے بغاوت میں حصہ لینے سے انکار کردیا تھا، مگر یہ تعلیم یافتہ ہندوستانی جدید تعلیم اور علم کی روشنی میں انگریزی راج کے سامراجی کردار کا تجزیہ کرنے اور ہندوستان کے نظم ونسق میں حصہ داری کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ ان لوگوں نے عوام کے درمیان ایک تحریک کو منظم کرنا شروع کیا اور 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز حکام پوری شدت سے اعلی تعلیم اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے خلاف ہوگئے۔ ———

بقیہ: صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں

ذیشان احمد مصباحی☆

۱۸۵۷ء کی ۱۵۰ سالہ تاریخ اور عصری تصورات

تاریخ گوئی یا قصہ گوئی: -۹ر اپریل ۲۰۰۷ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے انصاری آڈیٹوریم میں "انقلاب ۱۸۵۷ء اور اردو اخبارات" کے موضوع پر ایک سمپوزیم منعقد ہوا، یہ سمپوزیم شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ذمہ داران نے منعقد کی تھی، شرکاء میں محترمہ شیلا دکشت وزیر اعلیٰ دہلی، مولانا انظر شاہ کشمیری اور دوسری سیاسی و سماجی شخصیات شریک تھیں، میڈیا کی نظر التفات حاصل کرنے کے لیے علمی پروگراموں میں معروف غیر علمی ہستیوں کو دعوت دینا عصر حاضر کی مقبول روایت ہے اور مجموعی طور پر یہ سمپوزیم بھی اس روایت کا مکمل آئینہ دار تھا- اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ "انقلاب ۱۸۵۷ء اور اردو اخبارات" جو بنیادی موضوع تھا اس پر کسی خطیب نے ڈیڑھ سطری تبصرہ کرنے کی بھی زحمت نہیں کی، ایک دو صاحبان نے اگر اردو اخبارات کا ذکر کیا بھی تو بڑے تپاک سے مولانا ابوالکلام آزاد کے البلاغ اور الہلال کا اور مولانا محمد علی جوہر کے ہمدرد کا نام لیا اور بیشتر بارلیش حضرات نے سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے جوش جہاد کا تذکرہ بڑے کروفر سے کیا جن کی لڑائی انقلاب ۱۸۵۷ء سے ۲۶ سال پہلے سرحد کے سکھوں اور مسلمانوں سے ہوئی تھی- نامعقولیت کی حد تو یہ تھی کہ اکثر خطباء کا ش ق بھی درست نہیں تھا؛ "انقلاب" اور "زنگ آجادی" جیسے الفاظ کی سمع خراشی نے طبیعت مکدر کردی تھی- بالآخر وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کو اپنے پیش رو مقرروں کے بارے میں یہ کہنا پڑا کہ "ان کی زبان میں وہ چاشنی نہیں ہے جو دہلی اور لکھنؤ کی اردو میں پائی جاتی ہے-"

میں مصمم ارادے لیے بیٹھا تھا کہ آج تو یہ سوال کر ہی دینا ہے کہ کسی مقرر نے بنیادی موضوع سے متعلق ایک جملہ تک نہیں بولا، پھر آخر اس سمپوزیم کے انعقاد کا مقصد و ضرورت کیا ہے؟ لیکن افسوس کہ تنگی وقت کا بہانہ کرکے منتظمین نے سوال و جواب کے سیشن کو موقوف کرتے ہوئے فاتحانہ شان سے سمپوزیم ختم کر دیا ورنہ جو افسوس آج میں کر رہا ہوں اس وقت وہ کرتے-

۲۶ر جون ۲۰۰۷ء دن ۱۰ر بجے جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے پروفیسر سید عزیز الدین احمد سے انٹرویو کے لیے ملا تو انہوں نے بھی اس سمپوزیم کا بڑا کربناک ذکر کیا- ان کا فرمانا تھا کہ "بھئی! جب آپ کو تاریخ کا علم ہی نہیں تو تاریخ پر جلسہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے جب یہ واقعہ صوفی ناصر الدین سے سنایا تو وہ غرائے، وجہ دریافت کرنے پر کہنے لگے کہ آپ نے پروفیسر صاحب سے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ "مذہب چھوڑنے کے بعد جن لوگوں نے سائنس پر ایمان لایا تھا، آج سائنس کے مفروضات کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر وہ بھی سائنس کو فکشن (افسانہ) سے تعبیر کرنے لگے ہیں، پھر اگر کوئی تاریخ میں قصہ اور داستان کا لطف پیدا کر دے تو اس کا کیا گناہ؟" صوفی صاحب کی اس برجستگی نے مجھے لاجواب کر دیا اور مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ والوں نے ۱۸۵۷ء کی تاریخ کو ۲۱ویں صدی کے اخبارات سے جوڑ کر اور اس کا سرا کو سید احمد رائے بریلوی کی پنجاب اور سندھ میں لڑی جانے والی جنگوں (۱۸۲۶-۱۸۳۱ء) سے ملا کر کوئی گناہ نہیں کیا اور اس پر تاریخی نقطۂ نظر سے وہی تنقید کر سکتا ہے جس کی کوتاہ نظری تاریخ گوئی اور قصہ گوئی میں فرق کرتی ہوگی-

۱۸۵۷ء کی وہابیائی تعبیر: - پروفیسر خلیق احمد نظامی ایک محقق قلم کار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں- ان کا مرتب کردہ "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" (از عبد اللطیف دہلوی) میرے پیش نظر ہے، اس پر موصوف کا ۶۴ر صفحات پر پھیلا ہوا مبسوط مقدمہ بھی ہے، مقدمے کا یہ حصہ پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی- "حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کار کے خون سے آزادی کا پودا ہندوستان میں سینچا گیا- انگریزوں نے ان کی تحریک کی نوعیت کو خوب سمجھ لیا تھا اور وہ اس جذبہ سے بھی بے خبر نہ تھے جو جماعت مجاہدین کے قلب و جگر کو گرمائے ہوئے تھا- چنانچہ انہوں نے ایک طرف تو "وہابی" کا لقب دے کر اس مکتب خیال کے لوگوں کو ختم کیا اور دوسری طرف کوشش کرکے اس

☆z_almasmisbahi@yahoo.com

تحریک کو اس طرح پیش کیا اور کرایا جس سے متاخرین کو ایسا محسوس ہونے لگا گویا اس کا رخ محض سکھوں کی طرف تھا‘‘۔ (ندوۃ المصنفین اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، دسمبر ۱۹۷۱ء)

اول نظر میں حیرت کی وجہ یہ نہیں ہی کہ پروفیسر صاحب نے کوئی نئی بات کہہ دی تھی، بلکہ حیرت اس لیے ہوئی کہ پروفیسر موصوف جیسے شخص سے جن کا شمار محققین میں کیا جاتا ہے، آخر کیوں ہمیں اسی آواز کی بازگشت سنائی دے رہی ہے جو ہم غلام رسول مہر اور دوسرے نامور تاریخ سازوں کے صریر خامہ سے سن چکے ہیں۔ شروع میں یہ شبہ بھی پیدا ہوا کہ ایسے نامور افراد بلاوجہ کسی سے متاثر تو نہیں ہو سکتے، پھر یہ خیال گزرا کہ نامور بننے کے لیے بھی تو کسی معقول وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی، بسا اوقات نامعقولیت بھی شہرت کا سبب بن جاتی ہے۔ میں نے سر جھٹکا اور مطالعے کی طرف متوجہ ہو گیا، چوں کہ عقیدت مندوں کے لیے موافقین کی رائے مخالفین کی بہ نسبت زیادہ ٹھوس ہوتی ہے کیوں کہ مخالفین کی سچی باتوں کو بھی بسا اوقات جذبۂ مخالفت کا نتیجہ قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے، اس لیے میں نے سید احمد رائے بریلوی کے بارے میں ان کے مخالفین یعنی علمائے اہل سنت کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ رائے بریلوی صاحب کے ایک مشہور معتقد کی مشہور کتاب ’’سیرت سید احمد شہید‘‘ کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اس کی تلخیص ’’تذکرہ حضرت سید احمد شہید‘‘ بھی دیکھی اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ انگریزوں کے تعلق سے رائے بریلوی صاحب کے خیالات کیا تھے؟ اور انہوں نے ان کے خلاف کہاں تک فکری و عملی جہاد کیا؟ تلاش بسیار کے بعد بھی انگریزوں کی مخالفت یا ان سے جہاد کا کوئی واضح سراغ ہمیں مصنف کتاب مولانا ابوالحسن علی ندوی نہیں دے سکے، جنہیں رائے بریلوی صاحب سے خاندانی نسبت بھی حاصل ہے۔ بلکہ برعکس اس کے ایسی چیز ملی جس سے طلیق صاحب کے خیالات کی تردید ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً صفحہ ۴۱۸ پر مصنف لکھتے ہیں: ’’لیکن پچھلے برسوں میں بعض فاضل اہل علم کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب جنگ آزادی کے ایک رہنما تھے، جن کا مقصد وحید ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج اور ملک کو غیر ملکی حکومت سے آزاد کرا کے ایک خالص ملکی حکومت قائم کرنا تھا۔‘‘ ندوی صاحب نے تقریباً ۵ صفحات پر اس نظریے کی پرزور میں تردید کی ہے۔

۱۸۵۷ء کی تاریخ رقم کرنے والے اکثر مصنفین کا یہ وطیرہ بن چکا ہے کہ وہ تاریخ کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی آفاقی شخصیت سے کرتے ہیں، ان کی سیاسی، سماجی اور فکری تحریروں کی تعریف کرتے ہیں، ان کے افکار جہاں بانی و جہاں بینی کا ذکر کرتے ہیں (جن کا رشتہ ہندوستان کی آزادی سے جوڑنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ اسلام آزادی ہند کا سبب بنا کیوں کہ اسلام کی تعلیمات مجموعی طور پر آزادی کے حق میں ہیں نہ کہ غلامی کے حق میں) پھر حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی ایک تحریر کا حوالہ دیتے ہیں جس میں انہوں نے انگریزی تسلط کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد اس خانوادے کی تعریف جذباتی انداز میں کرتے ہیں اور پھر اسی خانوادے کے فرزند (اور فکری باغی) اسماعیل دہلوی اور ان کے شیخ سید احمد رائے بریلوی کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کی جہادی کارناموں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، پھر ۱۸۵۷ء کا ذکر کرتے ہیں۔۔۔ مزید یہ کہ وہ افراد جو نظریاتی طور پر احمد رائے بریلوی اور اسماعیل دہلوی کے متبع و مقلد ہیں اور جن کا کسی نہ کسی طرح جنگ آزادی ۱۹۴۷ میں نام بھی آتا ہے ان کا نام لے لیتے ہیں۔۔۔ اس جذباتی تاریخ نگاری کے بین السطور سے جو بات یاد کرائی جاتی ہے وہ یہ کہ ہندوستان کی آزادی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نظریات کی رہین منت ہے، جس کا علم عملی طور پر شاہ اسماعیل دہلوی، سید احمد رائے بریلوی اور ان کے معتقدین و متوسلین بلند کیے ہوتے تھے۔ چوں کہ ایک کھلی سچائی یہ ہے کہ اکثر اردو تاریخ نویس وہ افراد تھے جن کا سررشتہ رائے بریلوی اور اسماعیل دہلوی صاحب کے اس فکری نظام سے جا ملتا ہے جس کے خالق وہ خود تھے، نتیجے کے طور پر ۱۸۵۷ء کی تاریخ اپنے پس منظر و پیش منظر کے ساتھ ایسی تحقیقات کا مجموعہ بن گئی ہے جس میں انقلاب ۱۸۵۷ء کی حقیقی تصویر کے سوا سب کچھ ہے۔ چلتے چلتے یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ رائے بریلوی اور دہلوی صاحب کے پیروکاروں کا ’’وہابی‘‘ نام انگریزوں نے نہیں ہندوستانی سنی مسلمانوں نے رکھا ہے، برعکس اس کے وہابی علما کی درخواست پر انگریز حکومت نے ان کا نام ’’اہل حدیث‘‘ رکھا تھا۔ (ملاحظہ فرمائیں محمد جعفر تھانیسری کی کتاب تواریخ عجیب یعنی کالا پانی پر پروفیسر محمد ایوب قادری کا مقدمہ اور مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک)

رائے بریلوی صاحب کے جہاد کا مقصد - پروفیسر خلیق انجم صاحب کی محولہ بالا عبارت پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجے جو وہابیائی تحقیقات کا حاصل ہے۔ محولہ عبارت کا پہلا جملہ ہے "حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کار کے خون سے آزادی کا پودا ہندوستان میں سینچا گیا"۔ اس جملے پر تنقیدی نظر ڈالنے سے پہلے رائے بریلوی صاحب کی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں، رائے بریلوی صاحب یکم محرم ۱۲۰۱ھ /۱۷۸۶ء کو پیدا ہوئے، ۴؍سال ۴؍ماہ کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا، طبیعت پڑھنے کی طرف مائل نہ تھی (سیرت سید احمد شہید اول ۱۱۰) معاش کے مسئلہ سے دوچار حیران و پریشان ۲۰؍سال کی عمر میں دہلی پہنچے اور شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر دہلوی سے ملاقات اور استفادہ کیا (سوانح نگاروں کا اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے) ۲؍جون ۱۸۲۱ء یکم شوال ۱۲۳۶ھ کو حج کے لیے روانہ ہوئے اور ۳؍سال بعد ۱۸۲۴ء میں سفر حج سے واپس ہوئے، واپسی کے بعد ہی جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۷؍جنوری ۱۸۲۶ء/ ۷ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ کو رائے بریلی سے روانہ ہوئے اور گوالیار، ٹونک، اجمیر، پالی، عمرکوٹ، حیدرآباد، کوئٹہ، قندھار، کابل اور پشاور ہوتے ہوئے ۱۱؍دسمبر ۱۸۲۶ء/ ۱۸؍جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ کو نوشہرہ پہنچے ۴؍سالوں تک چھوٹی بڑی جھڑپیں اور جنگیں ہوتی رہیں، اور بالآخر ۲۴؍ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ کے میدان میں یہ داستان جہاد اپنے اختتام کو پہنچ گئی، ناکامی کیوں ہوئی؟ "تدبر" کے ساتھ مولانا محمد سلیمان قاسمی کی ان سطور کو پڑھا جائے تو بات واضح ہو جائے گی۔

"براہو نسلی غرور کا، براہو قبائلی عصبیت کا، براہو جہالت کا اور ستیاناس ہو علما سوء کی پھوٹ ڈالنے والی حرکات کا اور خدا معاف کرے مخلصین کی بے صبری، بے تدبیری اور ناتجربہ کاری کو، سب نے مل کر کیے کرائے پر پانی پھیر دیا، حنفیت اور وہابیت کے جھگڑے کھڑے کر دیے گئے، قبر پرستوں نے سرفروشان اسلام پر کفر کے فتوے داغے، سرحد کے پٹھانوں نے غداری کی"۔ (کربلا سے بالاکوٹ تک، ص: ۲۳۱، ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ستمبر ۲۰۰۵ء) ہر چند کہ یہ پوری عبارت رائے بریلوی صاحب کی گرداب عقیدت میں ڈوبی ہوئی ہے تاہم غیر شعوری طور پر وہ سارے حقائق سامنے آگئے ہیں جن کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ان میں دو باتیں نمایاں ہیں اول یہ کہ ان جہادیوں میں بے صبری، بے تدبیری اور ناتجربہ کاری تھی اور دوم یہ کہ شکست کی وجہ وہابیت اور حنفیت کا جھگڑا بنی۔ بلفظ دگر سید صاحب نے جہاد کا رخ سکھوں سے ہٹا کر مسلمانوں کی طرف پھیر دیا تھا۔

سید صاحب کی زندگی کو سامنے رکھیے اور اس کے بعد پروفیسر خلیق احمد کے اس ادعاء کا تجزیہ کیجیے کہ "حقیقت یہ ہے سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کار کے خون سے آزادی کا پودا ہندوستان میں سینچا گیا"۔ تو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ افق ذہن پر یہ چند سوالات یکایک کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(۱) یہ بات اس وقت درست تسلیم کی جاتی کہ سید صاحب اور ان کے رفقاء کار کا خون انگریزوں نے بہایا ہوتا۔

(۲) سید صاحب نے اپنی جنگ کے لیے فوج و سامان فراہم کرنے کے لیے جن علاقوں کا دورہ کیا ان میں اکثر انگریزوں کے زیر نگیں تھے، لیکن انگریزوں نے کہیں بھی سید صاحب کی اس "فوجی کارروائی" سے تعرض نہ کیا، کیا انگریز اتنے ہی بیوقوف تھے؟

(۳) سرحد کے علاقوں پر یا تو سکھوں کا قبضہ تھا یا مسلمانوں پر پھر آزادی کے پودے کی سینچائی کرنے سید صاحب کو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟

(۴) ہندوستان کے مرکز دہلی پر ایک کمزور سہی مسلم سلطنت قائم تھی۔ اور ہندوستانی علاقے نوابوں اور راجاؤں کے زیر نگیں تھے، ایسے میں انگریزوں کی ایک بیرونی طاقت تیزی سے ہر جگہ ہر معاملے میں دخیل ہوتی جارہی تھی۔ ایسی صورت حال میں جہاد کی صرف دو صورتیں ہو سکتی تھیں

(الف) سید صاحب دہلی کے تخت پر جلوہ فرما مغل شہنشاہ کے تعاون میں اپنی فکر و عمل کی ساری توانائیاں صرف کر دیتے اور اس وقت کی ایک مسلم حکومت کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دے کر ایک مضبوط سلطنت قائم کرتے اور پھر غیر ملکی تسلط ختم کرنے کی تدبیریں کرتے۔

(ب) سید صاحب اپنے اجتہاد کی بنیاد پر تخت دہلی پر جلوہ افروز شہنشاہ کو نااہل قرار دیتے اور اس کو معزول کر کے دوسری مستحکم مسلم/ اسلامی حکومت قائم کر کے اعلائے کلمۃ الحق کے لیے انگریزوں اور مشرکین سے جہاد کرتے۔ یا انگریزوں اور مشرکین سے ایک ساتھ جہاد کرتے۔

مگر سید صاحب نے ان دونوں میں سے کچھ بھی نہ کیا اور کسی مسلم حاکم و امام کے فرمان کے بغیر جو جہاد کی شرط ہے، ہزاروں میل کا سفر کیا اور جہاد کے نام پر غیر منظم لڑائیاں شروع کر دیں۔ انگریز و

ں سے رابطے ہموار ہیں، ہندو راجوں، مہاراجوں کی دعوتیں اڑا رہے ہیں اور جہاد کا رخ صرف سکھوں کی طرف اور حنفی سنی مسلمانوں کی طرف ہے۔ بالفرض اگر یہی عمل ان کا جہاد ہے تو اس جہاد سے ہندوستان کی آزادی کا کیا رشتہ؟

(۵) جناب شاہ حسین گردیزی صاحب کی تحقیقی کتاب ”حقائق تحریک بالاکوٹ“ میرے سامنے ہے، اس میں سید صاحب کے متعدد موافقین ومخالفین اور غیر جانب دار قلم کاروں کے حوالوں سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ سید صاحب کسی طور پر بھی انگریزوں کے مخالف نہیں تھے، ان حوالوں میں شیخ اکرام کا یہ اقتباس بڑا واضح ہے۔

”جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے، کسی شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ اتنے دور سکھوں سے جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہو، انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں وہ دین اسلام کے کیا منکر نہیں ہیں۔ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا ...... سید صاحب نے جواب دیا، سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے۔“ (حقائق تحریک بالاکوٹ ص ۷۱، مجلس اتحاد اسلامی کراچی، بحوالہ موج کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۲۰)

کیا اس کے بعد بھی سید صاحب کو تحریک آزادی کا ہیرو ثابت کرنے کا جنون صحت فکر کا اشاریہ ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ سوال بہر کیف اپنی جگہ پر رہ جاتا ہے کہ پھر سید صاحب کی ان معرکہ آرائیوں کا کیا مقصد تھا؟

میرا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب سید صاحب کی زندگی کے جزئیاتی واقعات میں تلاش کرنے کی بجائے سرحدی مسلمانوں اور خانوادۂ ولی اللّٰہی سمیت پورے ہندوستانی مسلمانوں کی دو خانوں میں تقسیم اور ان کے گزشتہ ۱۵۰ سالہ باہمی جنگ وجدال کا علمی، فکری اور نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو حقیقت حال سے آگہی زیادہ آسان ہو جائے گی۔ اور اگر خلیق احمد نظامی صاحب کے جملے کو معمولی تبدیلی کے ساتھ اس طرح کر دیا جائے کہ ”حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کار کے خون سے ”وہابیت“ کا پودا ہندوستان میں سینچا گیا۔“ تو یہ ایسی حقیقت ہوگی جس کا انکار سید صاحب کے موافقین اور مخالفین میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہ ہوگا۔

۱۸۵۷ء کی یاد، غفلت اور شکایت. ۔سال ۲۰۰۷ء شروع ہونے سے چند ماہ پیشتر ہی ایک دن حضرت مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب کی مجلس میں حاضر تھا، حضرت نے ۲۰۰۷ء کا ذکر کیا اور کہا کہ ”آنے والے سال ۲۰۰۷ء کو انقلاب ۱۸۵۷ء کے ۱۵۰ سال مکمل ہو جائیں گے، اس کی یاد حکومتی سطح پر بھی کچھ نہ کچھ منائی جائے گی اور غیر حکومتی سطح پر بھی۔ اس موقع پر ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اپنے طور پر سیمینار و سمپوزیم منعقد کریں، رسائل وجرائد کے خصوصی شمارے شائع کریں اور ان میں خاص طور پر ان علماء کو پیش کریں جن کا کردار انقلاب ۱۸۵۷ء میں کلیدی نوعیت کا ہے“

۲۰۰۷ء کی آمد کے ساتھ ہی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے علمی ترجمان ماہنامہ اشرفیہ شمارہ جنوری ۲۰۰۷ء کا اداریہ ”سال ۲۰۰۷ء انقلاب ۱۸۵۷ء کے نام“ تشریف لایا جس میں مدیر محترم مولانا مبارک حسین مصباحی نے اداریے کے مرکزی نکتے پر زور دینے کے ساتھ کئی دوسرے گوشوں کو اجاگر کیا۔ دوسرے اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات ورسائل میں بھی اس موضوع پر مضامین شائع ہوئے، مختلف زبانوں میں اس موضوع پر نئی نئی کتابیں بھی آئیں، مئی کے مہینے میں حکومتی سطح پر مختلف ثقافتی تقریبات منعقد ہوئیں، اب سال نصف سے زائد گزر گیا اور ۱۸۵۷ء کے تعلق سے امنگیں عموماً ختم ہو گئیں، تاہم میری معلومات کی حد تک ابھی ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور ایک ضخیم نمبر کی تیاری میں مصروف ہے، اس کے ساتھ ہی اعلیٰ پیمانے پر ایک سیمینار کے انعقاد کا بھی ارادہ رکھتا ہے، مولانا یٰسین اختر مصباحی کی کوششوں سے دہلی، ممبئی، لکھنؤ میں کئی پروگرام ہو چکے اور ابھی کئی تیاری کے مرحلے میں ہیں، تنظیم ابنائے اشرفیہ شاخ دہلی اور مسلم فاؤنڈیشن دہلی کے اشتراک سے عنقریب ایک پروگرام جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں منعقد ہونے کو ہے۔ مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب کی اب تک تین کتابیں ”انگریز نوازی کی حقیقت“، ”چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء“ اور ”علماء و قائدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء“ شائع ہو چکی ہیں، ”قائد جنگ آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی“ زیر اشاعت ہے، اور ان کے علاوہ ۱۸۵۷ء سے ہی متعلق کئی موضوعات حضرت مصباحی صاحب کے ذہن میں موجود اور صفحۂ قرطاس پر اترنے کے لیے بے تاب ہیں۔ (اطال اللہ بقاءہ وجعلہ نفعاً وخیراً للاسلام والمسلمین) اس کے

ساتھ ہی مولانا عبدالمالک مصباحی کی ایک عمدہ کتاب "جنگ آزادی اور وطن کے جانباز" جلد ہی شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ جام نور کا یہ شمارہ جو میرے محترم قاری کے پیش نظر ہے یہ بھی اسی زریں سلسلے کی ایک روشن کڑی ہے۔

ان یادوں کی بہاروں کے بعد ہمارے سماجی شعور کو تین احساسات سختی سے جکڑے ہوئے ہیں، یہ احساسات مختلف شکایات ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) ۱۸۵۷ء کی یاد شایان شان نہیں منائی گئی۔

(۲) مسلمانوں کو اور خصوصاً علماء کو نظر انداز کر دیا گیا یا ان کے کردار کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے واجبی طور پر وہ مستحق تھے۔

(۳) انقلاب کا مرکز ہندوستان کا مرکز رہا، جہاں جہادی جذبہ پیدا کرنے میں علمائے اہل سنت کا مرکزی کردار رہا، لیکن اردو کی معاصر تحریروں میں ان جید علماء کو شعوری طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔

ان شکایات واحساسات کے تجزیہ سے پیشتر لازم ہے کہ تاریخ کے مفہوم ومزاج کا تجزیہ کر لیا جائے، علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون اپنی شہرہ آفاق تصنیف "مقدمہ ابن خلدون" کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

"واضح رہے کہ تاریخ ایک مقبول، نفع بخش اور مقصد خیر کا حامل فن ہے، یہ گزشتہ قوموں کے اخلاق واطوار، انبیاء کرام کی سیرت طیبہ اور سلاطین کی حکومتوں اور ان کی تدابیر جہاں بانی کے احوال سے واقف کراتا ہے، یہاں تک کہ تاریخ کا طالب علم اپنے دینی ودنیوی امور میں ایک بصیرت حاصل کر لیتا"۔ (ص: ۸، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۲ء)

فن تاریخ کے موجد مسلم علماء نے تاریخ نگاری کو اسی مفہوم میں لیا تھا اور مذکورہ مقصد کے لیے ہی اس راہ پر خار کی آبلہ پائی کی تھی، لیکن عصر حاضر میں تاریخ نگاری کا مفہوم یکسر بدل چکا ہے، اب پیشگی طور پر کوئی مدعا طے کر لیا جاتا ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لیے چند دیمک خوردہ کتابوں کے حوالے پیش کر کے اپنے نظریے کی صداقت کا ڈھنڈورا پیٹ دیا جاتا۔ استشراق کے بعد تاریخ نگاری نے ایک نئی کروٹ لی اور غایت درجہ خطرناک بنیادی مقصد کو تحقیقات کے صفحوں میں چھپا کر بظاہر نیک مقاصد کے تحت تاریخ نگاری کی جانے لگی۔

تاریخ کے اس مزاج کو سامنے رکھنے کے بعد جب ہم اپنی شکایات پر دوبارہ نظر ڈالتے ہیں تو ہماری ساری شکایات بے سود اور لاحاصل معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی شکایت تو اس لیے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کی جد وجہد کا مرکزی مقصد (دیگر تمام اسباب ومقاصد کے ساتھ) راقم السطور کی نظر میں مسلم سلطنت کو دوبارہ سہارا دینا تھا اور اس پر مسلط غیر ملکی عیسائی تسلط کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس کی واضح دلیل چوٹی کے علماء کا فتویٰ جہاد دینا ہے، اس کے علاوہ دیگر مقاصد کے لیے فتویٰ جہاد دیے جانے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے جو انقلاب اس مقصد کے تحت برپا ہوا ہو اس کا بہت زیادہ چرچا موجودہ جمہوریت کے مفاد کے خلاف ہے، اس کا ذکر اسی قدر کافی ہے جس سے "ہندوستانی قومیت" ابھر کر ہو سکے، ملکی سطح پر کیے جانے والے انقلاب ۱۸۵۷ء کے چرچوں کا چشم بینا سے جائزہ لیا جائے تو اس مدعا پر کسی دلیل کی ضرورت بالکل ہی محسوس نہ ہوگی۔ دوسری شکایت کی وجہ بھی "ہندوستانیت" کا یہی مزاج ہے۔ تیسری شکایت کی وجہ بھی اردو مورخین اور قلم کاروں کی یہی "بامقصد تاریخ نگاری" ہے، چوں کہ ان میں بیشتر وہ افراد ہیں جن کا فکری سررشتہ ان علمائے اہل سنت سے کٹا ہوا ہے، پھر بھلا وہ تاریخ نگاری کے چکر میں ایسا کام کیوں کرنے لگے جس سے ان کے اسلاف کے فکری حریفوں کا نام روشن ہو — یہاں تک تو بات کسی قدر سمجھ میں آتی ہے لیکن اس کے بعد ان کا اہل سنت مجاہدین کی کردار کشی میں تاریخ نگاری کے نام پر مذبوحی حرکتیں کرنا ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔

آخر میں اپنی اس تساہلی کا برملا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم شکایت کے مرحلے میں اس لیے ہیں کہ جو کام ہمیں کرنا تھا وہ ہم نے نہیں کیا اور احمقانہ طور پر دوسروں سے یہ امید لگائے رہے کہ وہ ہمارا کام کر دیں گے۔ ہم اس رویہ کو بدل لیں تو پھر شکایت کی گنجائش ہی نہ رہ جائے گی۔ درج کردہ شکایات کے پہلے اور دوسرے نکات پر مسلم دانشوران کو بطور خاص سنجیدہ غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے، یہ اسلام، ریاست، عصر اور عروج وزوال کا سنگین مسئلہ ہے جس کی طرف یہاں صرف اشارہ ہی کر دینا ممکن ہے، سو میں نے کر دیا۔ رہی تیسری شکایت تو اس کے ازالے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا ہے، یہ ایک خوش آئند بات ہے، تاہم اس عمل میں عموماً "ردعمل" کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے، اس لیے اس موضوع پر لکھنے والوں سے صرف یہی گزارش ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں معروضیت لاتے اور عصری اسلوب کی پیروی کرنے کی کوشش کریں۔ ☆☆☆

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری☆

مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی

جہاد آزادی ۱۸۵۷ء میں جو علماء کرام صف اول میں ملک و ملت کے لئے اپنی جان و مال کی قربانی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ان میں ایک نمایاں نام مولانا فیض احمد بدایونی کا بھی ہے، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا بدایونی کی خدمات اتنی نمایاں اور اہم ہیں کہ ان کے ذکر کے بغیر تاریخ جنگ آزادی ادھوری سمجھی جائے گی۔ مجاہدین آزادی پر لکھے جانے والے اکثر مضامین اور مقالات میں کسی نہ کسی جہت سے مولانا کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے، اور مورخین و محققین نے مختلف زاویوں سے جہاد آزادی میں ان کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے، جس کے نتیجے میں جد و جہد آزادی کے سلسلہ میں مولانا کا کردار اب محتاج تعارف نہیں رہا، (ممکن ہے جام نور کے زیر نظر شمارے میں بھی اہل قلم نے مولانا کی شخصیت کے اس پہلو پر خامہ فرسائی کی ہو) مولانا کی سیرت، سوانح اور تذکروں پر ان کے مجاہدانہ کردار کا کچھ ایسا رنگ چڑھا کہ اس کے آگے مولانا کی عالمانہ شاعرانہ اور صوفیانہ حیثیت دب کر رہ گئی، ان کی شہرت ایک مجاہد آزادی کی حیثیت سے ہوگئی، جو ہونا بھی چاہیے تھی اور مولانا اس کے بجا طور پر مستحق تھے، مگر وہ ایک متبحر عالم، مصنف، مدرس، عربی کے بلند پایہ شاعر، صاحب طرز انشا پرداز اور ایک صاحب حال بزرگ بھی تھے، مولانا کی شخصیت کے یہ پہلو بہت کم روشنی میں آسکے، اسی لیے اس مختصر مقالہ میں ہم مولانا کی ہشت پہلو شخصیت کے انہی گمنام گوشوں کو زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔

مولانا فیض احمد بدایونی کی ولادت ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء کو مولوی محلہ بدایوں میں ہوئی، مولانا کے والد مولانا حکیم غلام احمد عثمانی بدایوں کے مشہور عثمانی خاندان کے جلیل القدر فرزند اور جید عالم دین تھے، مولانا کی والدہ حضرت شاہ عین الحق عبد المجید قادری بدایونی (ولادت ۱۱۷۷ھ وفات ۱۲۶۳ھ- بانی خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں و خلیفۂ مجاز شمس مارہرہ حضرت آل احمد اچھے میاں مارہروی) کی صاحبزادی تھیں۔ مولانا فیض احمد کی عمر ابھی صرف ۳ برس تھی کہ ۱۲۲۶ھ میں ان کے والد گرامی حکیم غلام احمد عثمانی کا انتقال ہوگیا، والد کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد آپ کی والدہ نے آپ کی پرورش کی، جب مولانا تعلیم و تعلم کی عمر کو پہونچے تو آپ کی والدہ نے اپنے اس لخت جگر کو اپنے حقیقی بھائی سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی کے سپرد کر دیا، مولانا فیض احمد نے اپنے شفیق ماموں کی درسگاہ سے علوم و فنون کی تکمیل کی۔ پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں: "مولانا فیض احمد بدایونی نے تمام علوم منقول و معقول اپنے ماموں اور شفیق استاذ مولانا فضل رسول سے صرف چودہ سال کی عمر میں حاصل کئے، اور پندرہویں سالگرہ سے قبل آپ کو اجازت درس مل گئی۔ دوسرے فنون مروجہ خطاطی شعر و شاعری وغیرہ میں بھی آپ نے کمال حاصل کیا، ایک قلیل عرصہ میں آپ کا شہرہ ہوگیا اور تشنگان علم نے اس منبع علم و فضل کی طرف رخ کیا"۔(۱)

مولانا فیض احمد کے بارے میں خود ان کے استاذ اور اپنے وقت کے امام العلماء حضرت شاہ فضل رسول بدایونی فرماتے ہیں

"بفضلہ تعالیٰ فیض احمد مذکور کہ ہمشیرزادہ و نور دیدہ و لخت دل و قوت بازوئے خاکسار است جامع کمالات انسانی است در علوم مروجہ بر معاصرین بالادست"۔(۲)

(بفضلہ تعالیٰ فیض احمد جو اس خاکسار کا بھانجہ، نور دیدہ، لخت دل اور قوت بازو ہے، کمالات انسانی کا جامع اور مروجہ علوم میں اپنے معاصرین پر فائق ہے)۔

تمام مروجہ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد مولانا فیض احمد نے درسگاہ آراستہ کی اور بے شمار تشنگان علوم و معارف نے ان سے فیض حاصل کیا- اس کے بعد آپ علوم باطنی اور سلوک الی اللہ کی طرف متوجہ ہوئے، صاحب اکمل التاریخ مولانا ضیاء القادری لکھتے ہیں "جب تکمیل سے فراغ کامل حاصل ہوا تو دولت بیعت اپنے مقدس نانا حضرت سیدی شاہ عین الحق عبد المجید قدس سرہ سے پائی"-(۳)

علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل اور کچھ عرصہ بدایوں میں درس و تدریس کا سلسلہ دراز کرنے کے بعد مولانا فیض احمد آگرہ چلے گئے آگرہ اس وقت صوبہ متحدہ کی راجدھانی تھی، مولانا بدایونی وہاں پر پہلے

☆Madrasa Alia Qadria,Molvi Mohalla,Budaun(U.P.) E-mail qadriusaid@yahoo.com

مثل خواں پھر پیش کار اور بعد میں بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں

"آگرہ اس وقت صوبے کا صدر مقام تھا، صدر نظامت آگرہ میں اول آپ مثل خواں پھر پیش کار رہوئے اور آخر میں بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار ہوئے"۔(۴)

آپ کے قیام آگرہ کے زمانے میں مشہور مستشرق سر ولیم میور جو اس وقت مجسٹریٹ تھا آپ کا شاگرد ہوا اور اس نے آپ سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں: "اس زمانے میں ولیم میور نے جو وہاں مجسٹریٹ علاقہ فوج تھا اور بعد کو لفٹنٹ گورنر صوبہ یو. پی (۱۸۶۸ء۔۱۸۷۲ء) ہوا نے آپ سے عربی پڑھی"۔(۵)

صاحب اکمل التاریخ آپ کی ملازمت اور ولیم میور کے عربی پڑھنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس کے بعد سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوکر اس عہدۂ جلیلہ پر مامور ہوئے کہ تمام سیاہ وسپید آپ کے ہاتھ میں تھا، اس وقت آگرہ صوبے کا صدر مقام تھا، آپ لفٹنٹی سررشتہ دار تھے، ثروت وامارت خاندانی کے سوا عہدہ کی وجاہت اس پر طرہ یہ کہ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر بہادر صوبہ آگرہ اودھ آپ کے شاگرد خاص واحترام کنندہ"۔(۶)

وہ علماء اہل سنت جنہوں نے انقلاب ۵۷ء سے قبل یا بعد انگریزی حکومت کی ملازمت قبول کی ان کے بارے میں ایک طبقہ کی طرف سے عجیب وغریب افسانہ طرازیاں کی جاتی ہیں، اگرچہ ان افسانہ طرازیوں کو حقیقت کا آئینہ دکھانے کا یہ موقع نہیں ہے، اور نہ ہی یہ مختصر مقالہ اس تفصیلی بحث کا متحمل ہوسکتا ہے، تاہم آگے بڑھنے سے پہلے ہم علامہ عبدالحکیم شرف قادری صاحب کے دو اقتباسات نقل کرنا چاہتے ہیں جن سے اس معاملہ کی حقیقت تک پہونچنے میں مدد مل سکتی ہے۔ علامہ شرف قادری لکھتے ہیں

"فقط سرکاری ملازم ہونا کوئی جرم کی بات نہیں ہے، بشرطیکہ کسی خلاف اسلام امر میں ان کا تعاون نہ کیا جائے، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے مولوی عبدالحی کو ملازمت کی اجازت دے کر اس قسم کے شبہات کو ختم کر دیا تھا، سرکاری ملازمت سے ہر شخص کے بارے میں یہ رائے قائم کر لینا کہ یہ انگریز کا خیر خواہ ووفادار اور محب ہے کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے، کیوں کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں اکثر وبیشتر انہی علما نے کھل کر حصہ لیا جو انگریز کے دور اقتدار میں صدر الصدور اور افتاء وغیرہ کے مناصب پر فائز تھے"۔(۷)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں "تعجب ہے کہ جب علماء دیوبند میں سے مولوی محمد احسن نانوتوی، مولوی محمد مظہر، مولوی محمد منیر، مولوی ذوالفقار علی، مولوی فضل الرحمن، مولوی مملوک علی اور مولوی محمد یعقوب نانوتوی وغیرہم بھی "سرکار انگریز" کے ملازم تھے تو فرنگی حکومت کے اقتدار کو مضبوط تر کرنے کا الزام علماء اہل سنت پر ہی کیوں عائد کیا جاتا ہے؟ پھر یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ اگر علما منصب افتاء وقضاء اور صدر الصدوری کو قبول نہ کرتے تو ان مناصب پر فائز ہوکر فیصلہ کرنے والے ہندو ہوتے یا انگریز، کیا یہ اچھا ہوتا کہ علما ان منصب کو قبول نہ کرتے اور مسلمان اپنے مقدمات کے فیصلوں کے لئے ہندو یا انگریز کی کچہریوں میں مارے مارے پھرتے"۔(۸)

مولانا فیض احمد بدایونی کی تصنیفات - خداوند قدوس نے مولانا کو تصنیف وتالیف کا زبردست شعور اور اعلی ذوق عطا فرمایا تھا، آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود علوم وفنون کا ایک ذخیرہ اپنی تصانیف کی صورت میں چھوڑا تھا مگر یہ المیہ ہی ہے کہ ان میں سے اکثر کتب مع اپنے نام کے مفقود ہو گئیں۔

حضرت تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی تحریر فرماتے ہیں:

"جناب استاذ الاساتذہ مولانا (فیض احمد) علیہ الرحمۃ دفتر ہا تالیف فرمودند ودر اکثر علوم مصنفات شاں بودند"۔(۹)

(جناب مولانا فیض احمد علیہ الرحمۃ نے دفتر کے دفتر تصنیف کیے، اور اکثر علوم میں ان کی تصنیفات تھیں)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم وفن کے کیسے کیسے جواہر پاروں سے آپ نے صفحۂ قرطاس کو مزین کیا ہوگا، پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں

"مولانا فیض احمد تصانیف کثیرہ کے مالک تھے، طبیعت میں استغناء بدرجۂ کمال تھا، اکثر تحریرات ومسودات شاگرد لے گئے، اور ان کی واپسی نہ ہوئی"۔(۱۰)

اس طرح آپ کی تصانیف محفوظ نہ رہ سکیں، آخر میں جو ذخیرہ بچا وہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گیا، تاج الفحول تحریر فرماتے ہیں:

"در فتنۂ عامہ اکثر تصانیف ومسودات شاں ضائع وتلف گردیدند"۔(۱۱)

آپ کا ذخیرۂ تصنیف ضائع ہونے کے بعد آج ہمارے پاس مولانا کی صرف پانچ کتابیں ہیں تین مطبوعہ صورت میں ایک مخطوطے کی شکل میں اور ایک کا صرف نام ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

(۱) حاشیہ صدرا:۔ مولانا نے جس عہد میں آنکھ کھولی اور جس ماحول اور زمانے میں تعلیم حاصل کی وہ دینی درسگاہوں پر منطق وفلسفہ کے تسلط کا زمانہ تھا، درس نظامی کے نصاب میں ایک بہت بڑی تعداد میں منطق وفلسفہ کی کتب داخل تھیں، اس دور کا مذاق تصنیف وتالیف بھی زیادہ تر معقولات کی کتب پر حواشی تعلیقات، اور شروح تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ہدایت الحکمت فلسفہ قدیمہ کا مشہور متن ہے، ملا صدر الدین شیرازی نے اس کی شرح تصنیف کی جو صدرا کے نام سے مشہور ہے، یہ کتاب اب سے کچھ عرصہ پہلے تک درس نظامی کے نصاب میں داخل تھی، اس کی بے شمار شروح اور حواشی لکھے گئے ہیں، مولانا فیض احمد بدایونی نے بھی اس پر حاشیہ لکھ کر داد تحقیق دی ہے، مولانا کا یہ حاشیہ غیر مطبوعہ ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں کے کتب خانہ میں اور ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے حبیب گنج کلکشن میں محفوظ ہے، جس زمانہ میں راقم الحروف معقولات کی تحصیل کر رہا تھا اس وقت اس حاشیہ کو دیکھا تھا اور بعض مقامات سے استفادہ بھی کیا تھا، یہ حاشیہ عربی میں ہے اور اس کو دیکھ کر مولانا کی معقولی شان کا کسی حد تک اندازہ ہوتا ہے۔

(۲) تعلیقات علی فصوص الفارابی:۔ مولانا کے تذکرہ نگاروں نے ''فصوص الفارابی'' پر مولانا کی تعلیقات کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن یہ کتاب راقم کی نظر سے نہیں گذری اور نہ ہی اس کے کسی قلمی نسخہ کی موجودگی کا علم ہو سکا، غالب گمان یہی ہے کہ یہ بھی مولانا کی دیگر تصنیفات کی طرح مفقود ہو گئی۔

(۳) تعلیم الجاہل:۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے نواسے شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی (ولادت ۱۱۹۶ھ۔ وفات ۱۲۶۲ھ) نے شاہ اسماعیل دہلوی کے افکار وآراء سے متاثر ہو کر ''مأۃ مسائل'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس کے جواب میں سیف اللہ المسلول مولانا فضل رسول قادری نے ''تصحیح المسائل'' تحریر فرمائی، حضرت کی اس کتاب کے جواب میں مولانا بشیر الدین قنوجی نے ''تفہیم المسائل'' نام کا رسالہ تصنیف کیا، قنوجی صاحب کی اس کتاب کے جواب میں مولانا فیض احمد نے ''تعلیم الجاہل'' نام سے کتاب لکھی، اور قنوجی صاحب کو مسکت جواب دیا۔ یہ کتاب ۱۳۲۹ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔

(۴) ہدیۂ قادریہ:۔ یہ مولانا کے عربی قصائد کا مجموعہ ہے، اس میں ۳۲ قصائد ہیں جو گیارہ سو گیارہ اشعار پر مشتمل ہیں، یہ تمام قصائد شاہ جیلاں حضور غوث اعظم کی منقبت میں ہیں، ہدیۂ قادریہ کی تصنیف کا آغاز اس طرح ہوا کہ ۱۸۳۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے موقع پر مولانا کے شاگرد سر ولیم میور نے عربی میں قصیدہ تہنیت کہنے کی فرمائش کی، رات بھر کوشش کے باوجود چند اشعار سے زیادہ نہ کہہ سکے، خیال پیدا ہوا کہ ایک دنیاوی حاکم کی مدح وستائش کرنے کے لئے کتنا وقت ضائع کیا، کاش یہ وقت اپنے مرکز عقیدت سرکار غوثیت مآب کی منقبت میں صرف ہوتا، یہ خیال آتے ہی وضو کیا تو نفل ادا کیے اور منقبت لکھنے بیٹھ گئے، نماز فجر سے پہلے ایک سو گیارہ اشعار کا قصیدہ جو صنائع لفظی اور بدائع معنوی سے آراستہ ہے نظم کر دیا۔ (۱۲) یہ ''ہدیۂ قادریہ'' کا پہلا قصیدہ ہے۔ اس کے بعد باقی قصائد بھی چند نشستوں میں نظم کیے۔ حضرت تاج الفحول فرماتے ہیں:

''من بعد بقیہ قصائد ہدیہ قادریہ ہم در چند جلسہ تالیف فرمودند''۔ (۱۳)

نقیب الاشراف سید سلیمان گیلانی صاحب سجادہ آستانہ غوثیہ بغداد شریف کے حکم سے حضرت تاج الفحول نے اس کو پہلی مرتبہ شائع کروایا، ہدیہ قادریہ پر شہزادۂ تاج الفحول مولانا شاہ عبد المقتدر قادری بدایونی نے عربی میں مقدمہ اور حواشی تحریر فرمائے، یہ کتاب اس مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ۱۳۰۳ھ میں مطبع حسیم سحر بدایوں سے شائع ہوئی۔ ہدیہ قادریہ کے بارے میں پروفیسر ایوب قادری نے لکھا ہے

''ان قصائد عربیہ کی تعریف اعیان ومشاہیر بغداد نے کی، اور آپ کی عربی نظم ونثر کو سراہا، غرض کہ آپ پچھلی صدی میں برصغیر میں عربی کے صاحب طرز شاعر تھے''۔ (۱۴)

پروفیسر صاحب کے بیان کی تائید اس بات سے ہوتی کہ بغداد معلی کے ایک عالم، شیخ طریقت اور صاحب تصانیف حضرت شیخ عبد اللہ بن محمد القادری الشافعی الجیلانی نے اپنی کتاب ''الدر الناظر فی مناقب القطب الربانی الشیخ عبد القادر'' میں ہدیہ قادریہ کے دو قصائد نقل کیے ہیں، صفحہ ۱۰۱ پر ہدیۂ قادریہ کا پہلا قصیدہ ''یا صاح قد سهرت عینی ولم تنم'' اور صفحہ ۵۵۹ پر دوسرا قصیدہ ''یا عتلی

فی شدة وسکاره" -اس سے مولانا کے کلام کی علماء بغداد میں مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا ضیاء القادری لکھتے ہیں

"عربی میں آپ کا ادب اہل عرب کے لئے باعث رشک ہے۔ ہدیہ قادریہ حضرت تاج الفحول نے جب بغداد شریف میں نذر گزارا تو وہاں کے بڑے بڑے ادیب تعجب کرتے تھے، اور کسی ہندی کے کلام ہونے کا یقین نہ آتا تھا"۔ (۱۵)

(۵) المقامة البغدادية -مقامات حریری کی طرز پر مولانا نے یہ کتاب لکھی ہے، اس میں ایک ہزار ایک سو گیارہ فصیح و بلیغ اور مقفی و مسجع جملے ہیں، یہ بھی شاہ جیلان حضور غوث اعظم کی منقبت میں ہے، اس سے جہاں مولانا کی عربی دانی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ان کی غوث اعظم سے عقیدت و محبت کا بھی پتا چلتا ہے، یہ رسالہ بھی ہدیہ قادریہ کے ساتھ ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوا تھا۔

• **مجاہدانہ کردار** -زمانہ قیام آگرہ میں مولانا فیض احمد کی ملاقات مولانا شاہ احمد اللہ مدراسی سے ہوئی، شاہ صاحب کی صحبت کے اثر نے مولانا فیض احمد کے اندر جذبۂ جہاد پیدا کیا، شاہ احمد اللہ مدراسی کی ہی تحریک پر ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ استاذ مطلق علامہ فضل حق خیر آبادی کا وہ مشہور فتویٰ جہاد جس نے مسلمانوں کے دلوں میں جذبۂ جہاد اور سرفروشی و جاں سپاری کی ایک لہر دوڑا دی تھی اس پر جن چند علما نے تصدیقی دستخط ثبت کیے ان میں مولانا فیض احمد بدایونی کا نام نمایاں ہے، اس فتوے پر مولانا فیض احمد کے علاوہ مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی عبد القادر، اور قاضی فیض اللہ دہلوی نے دستخط کیے تھے۔

مولانا کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں: "جب میرٹھ اور آگرہ کی فوجوں کی بغاوت اور مجاہدین کے معرکوں کی خبر آگرہ پہونچی، تو جونس کالون لفٹنٹ گورنر بہادر نے سب فوج ہندستانی اور انگریزی کو جمع کر کے فہمائش کی، اس کا اثر چند روز رہا مگر پھر آگرہ کی فوج بھی باغی ہوگئی اور مجاہدین سے مل گئی، اور آزادی وطن میں کوشاں ہوئی، انگریزوں نے قلعہ کو جائے پناہ قرار دیا، ماہ جون میں یہاں بھی واقعات شروع ہوئے، جولائی میں تیزی آئی، مجاہدین فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے کی مگر جب حالات کا گیرائی سے جائزہ لیا اور دہلی سے طلبی ہوئی تو کچھ مسلح سپاہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی دہلی روانہ ہو گئے"۔ (۱۶)

دہلی میں جنرل بخت خاں مورچہ سنبھالے ہوئے تھے، دہلی پہونچ کر مولانا فیض احمد بدایونی اور ان کے ساتھی جنرل بخت خاں کے ساتھ معرکہ میں شریک ہو گئے، ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی میں ہڈسن کے زیر کمان انگریز فوج نے مکمل قبضہ کر لیا، اس لئے جنرل بخت خان، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد لکھنؤ کی طرف روانہ ہو گئے لکھنؤ میں انگریزی فوج سے پہلی جھڑپ نواب گنج کے علاقے میں ہوئی، جس میں مجاہدین کو کامیابی ملی، مگر عالم باغ میں مجاہدین کو ایک اور معرکہ پیش آیا، اس معرکہ میں جنرل مارٹن نے خود مورچہ سنبھالا، اور اس کے مدمقابل جنرل بخت خان اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ سینہ تان کر آئے، چکر والی کوٹھی پر ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی نے مورچہ سنبھالا، اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

مولانا فیض احمد لکھنؤ سے بدایوں آئے اور یہاں آ کر لوگوں میں جذبۂ جہاد کی روح پھونک دی، جس کے نتیجہ میں قصبہ ککرالہ میں معرکہ ہوا، جس میں تقریباً ایک ہزار مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب شاہ احمد اللہ مدراسی شاہ جہانپور پہونچ چکے تھے، لہٰذا معرکۂ ککرالہ کے بعد مولانا فیض احمد، فیروز شاہ اور ڈاکٹر وزیر خاں بریلی ہوتے ہوئے شاہجہانپور شاہ احمد اللہ مدراسی کے پاس آ گئے۔ دہلی اور لکھنؤ کے بعد بدایوں، بریلی، مراد آباد، فرخ آباد، اور شاہجہان پور پر بھی انگریز مکمل طور پر قابض ہو گئے، پھر مجاہدین کو "بغاوت" کے جرم میں پکڑ پکڑ کر پھانسی اور قید وغیرہ کی سزا دینے کا دور شروع ہوا، مجاہدین آزادی کا ہندستان میں رہنا دشوار ہو گیا، چنانچہ فیروز شاہ اور ڈاکٹر وزیر خاں حجاز کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، مگر مولانا فیض احمد صاحب کا کچھ پتا نہیں چل سکا کہ ہجرت کر گئے یا شہید کر دیے گئے۔

مولانا کے ماموں اور مشفق استاذ سیف اللہ المسلول شاہ فضل رسول بدایونی نے مولانا کی تلاش میں بلاد عرب کا سفر کیا لیکن مولانا کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ آج مولانا کا نشان مزار نہیں ہے نہ سہی لیکن وہ اپنے مجاہدانہ کارناموں سے تاریخ میں ایسے انمٹ نقوش چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے، ایسی ہی شخصیات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ؎ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما ☆☆☆

ماخذ صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ کریں

انقلاب ۱۸۵۷ء ناکام کیوں ہوگیا؟

نوٹ: ماہنامہ ''جام نور'' اپنے اس کالم میں عصر حاضر کے کسی بھی مسئلہ کے تحت ہندوستان کے نامور علمائے کرام ودانشوران قوم وملت سے ان کی تحریری رائے لیتا ہے۔ موصول ہونے والی آراء خواہ وہ مثبت یا منفی پہلو پر ہوں، شائع کی جاتی ہیں تاکہ متعلقہ مسئلے کے دونوں پہلو ارباب علم ونظر اور عام قارئین تک پہنچ سکیں اور متعلقہ مسئلہ پر علمائے کرام ودانشوران قوم کی تحقیقی وتجزیاتی رائے کی روشنی میں مسئلے کے صحیح نتائج برآمد ہو سکیں۔ علماء ودانشوران کی سہولت کے پیش نظر مندرجہ بالا سوال سے متعلق چند ذیلی نکات بھی دیے گئے تھے، تاکہ مندرجہ ذیل خطوط پر دلائل و براہین کے ساتھ وہ اپنا تحقیقی جواب دے سکیں۔ (ادارہ)

نکات

{۱} ہندوستانیوں کی طرف سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا فیصلہ صحیح اور بروقت تھا یا نہیں؟
{۲} انقلاب کی ناکامی کی وجہ مذہبی اور ملی تھی یا سیاسی اور معاشی؟ یا کچھ اور؟
{۳} بہادر شاہ ظفر کی سیاسی بصیرت کم تھی یا پھر حالات نے انہیں شکست وریخت سے دوچار کر دیا تھا؟
{۴} شکست کے باوجود ۱۹۴۷ء کی آزادی پر اس کے مثبت اثرات کیا رہے؟

> ''اگر ہم اس انقلاب کی ناکامی کی کوئی وجہ بتائیں تو وہ مذہبی، ملی، سیاسی یا معاشی نہیں ہو سکتی، بلکہ تاریخی ہے، یہ تاریخی وجہ بنیادی طور پر وہ خوف تھا، جو گذشتہ سو سال کی مدت میں ہندوستانیوں کے دلوں پر بیٹھتا چلا گیا''
>
> **ڈاکٹر اخلاق احمد آہن☆**

انقلاب ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰ویں سالگرہ کے موقع پر ایک بار پھر اس عظیم واقعہ کے مختلف پہلوؤں پر مباحثوں اور تاریخ کے اس دور میں جھانکنے اور ان کا تجزیہ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ ایک طرف جہاں اس سالگرہ کے موقع پر ہم اپنے شہیدوں کی قربانیوں کو یاد کر رہے ہیں، جنہوں نے وطن کی حفاظت کیلئے سامراج سے ٹکر لیا، وہیں دوسری طرف ایک طبقہ تاریخ کے مطالعہ کے حوالے سے بعض سوالات کے جوابات اور ان کی تفہیم کیلئے بھی کوشاں نظر آتا ہے کہ آیا یہ انقلاب جو بنگال کے ایک چھوٹے واقعہ سے شروع ہو کر تقریباً ہندوستان گیر سطح پر پھیل گیا اور اس وسیع پیمانہ پر تباہیوں کا سبب بنا، وہ صحیح اور بروقت تھا بھی یا نہیں؟ اس سوال کا جواب ۱۸۵۷ء سے قبل اور اس دور کے متعدد واقعات وحادثات سے جڑا ہوا ہے۔ یہ انقلاب کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو اچانک ہی رونما ہو گیا یا سماج کے ہر طبقہ، مذہب، ملت، مسلک، برادری، خطہ کے لوگ ساری دوریوں کو بھلا کر اور قدم سے قدم ملا کر بلا وجہ ہی دیس اور ہندوستانی سماج کے دشمنوں کے خلاف مورچہ بند نہیں ہو گئے۔ یہ بھی دھیان دینے کی بات ہے کہ اس وقت کا ہندوستانی سماج زیادہ روایت پسند اور اپنی تہذیبی قدروں سے ہمارے مقابلہ زیادہ شدت سے جڑا ہوا تھا لیکن اپنی ریتیوں، رواجوں سے گہری اور بعض معاملات میں متشددانہ وابستگی کے باوجود ایک دوسرے سے محبت اور احترام کا جذبہ رکھتا تھا اور صحیح معنوں میں یہی ہندوستانی تہذیب کی روح تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء سے تقریباً سو سال پہلے سے ہندوستان کے مختلف خطوں میں جس طرح کے واقعات مسلسل پیش آتے رہے، اس نے ہندوستانی ذہن کو نہ صرف بیدار کیا، اسے جھنجھوڑا، بلکہ یہ احساس دلا دیا کہ اب ان کے مذاہب، ان کی قدریں، ان کا ملک، ان کے مفادات سب خطرے میں ہیں۔ چنانچہ جس علاقہ، خطہ یا قومیت کے لوگوں میں یہ احساس جاگا، انہوں نے محدود سطح پر ہی سہی اور محدود نصب العین کے ساتھ ہی سہی، یہ جنگ لڑی۔ دراصل یہ جنگ کی پڑاؤں

☆T-69, NEW TRANSIT HOUSE, J N U , NEW DELHI- 110067

ہے گزر کر ۱۸۵۷ء کی دہلیز پر پہنچی اور ایک منظم شکل اختیار کر گئی۔ ان میں ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی انگریزوں کے ساتھ لڑائی، ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی شہادت، ۱۸۲۴ء میں بیرک پور کی بغاوت، ۱۸۴۵ء میں سکھوں کی لڑائی، ۱۸۵۵ء میں سنتھال بغاوت اور اسی طرح شہادتوں اور قربانیوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ ۱۸۵۷ء تک ہندوستان کی اکثریت کو مجموعی طور پر اس کا استحضار ہو چکا تھا کہ یہ ملک وملت و مذہب وثقافت کو بچانے کا آخری موقع ہے، اس لئے اس جنگ کے فیصلہ میں مجموعی طور پر تمام لوگوں کی شمولیت نہ ہونے کے باوجود بھی، اس احساس نے سب کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا۔ اس آتش فشاں کی اطلاع انگریزوں کو بھی تھی اور ہندوستانیوں کو بھی۔ ہم آج ایک جملہ میں اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ، اس کی ناکامی یا نتائج کی بنیاد پر نہیں دے سکتے، کیونکہ اس وقت ہندوستانیوں کی حالت 'نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن' والی تھی۔ کیونکہ ان کے لیے ان کا مذہب، ان کی ثقافت، ان کا معاش، ان کا وقار سب کچھ داؤں پر تھا۔ جس کے بغیر ان کے لیے جینے کا کوئی مقصد نہ تھا اور انگریز ان سب کو ملیامیٹ کرنے پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔

دوسری طرف ایک ایسے طبقہ کی نقاب کشائی ہوئی، جس نے تذبذب، ہچکچاہٹ یا ابن الوقتی میں اپنے قدم پیچھے ہٹا لئے، یہاں تک کہ غداری کا مرتکب ہوا اور اس کے نتیجہ میں یہ کوشش ناکامی کا شکار ہو گئی۔ عام طور سے اتنے بڑے واقعہ کے رونما ہوتے یا پا اس کی ناکامی کامرانی کی کوئی ایک وجہ نہیں ہو سکتی، نہ ہی کسی ایک شخص، خاص طور سے بہادر شاہ ظفر پر اس کی شکست کی ذمہ داری عاید کی جا سکتی ہے۔ وہ خود عملی طور پر برٹش حکومت کے قیدی تھے اور ان کی حکومت قلعہ تک محدود تھی۔ اس جنگ میں شامل ہونا اور اس میں قربانیاں دینا ان کا جذبہ تو ہو سکتا تھا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس جنگ کی کمانڈ نہ ان کے ہاتھ میں تھی، نہ وہ پوری طرح سے اس کو انجام دے سکنے کی پوزیشن میں تھے۔ اگر ہم اس انقلاب کی ناکامی کی کوئی وجہ بتائیں تو وہ مذہبی، ملی، سیاسی یا معاشی نہیں ہو سکتی، بلکہ تاریخی ہے اور یہی متعدد گروہوں اور علاقوں کی سرد مہری یا غداری کا سبب بنا۔ یہ تاریخی وجہ بنیادی طور پر وہ خوف تھا، جو گذشتہ سو سال کی مدت میں ہندوستانیوں کے دلوں پر بیٹھتا چلا گیا تھا اور اسی ڈر کے سبب قوم کا ایک بڑا حصہ کسی کامیابی کی طرف سے بے یقینی کا شکار رہا اور نتیجتاً انگریزوں کا ہم نوا یا خاموش تماشائی بن کر رہا۔ گذشتہ سو سال میں ہندوستانی طاقتیں تقریباً ہر محاذ پر انگریزوں سے شکست کھاتی آ رہی تھیں۔ ہندوستان کی بڑی بڑی ریاستیں زمیں بوس ہو گئیں اور تحلیل ہو کر انگریزی سامراج کا حصہ بن گئیں یا ان کی مہرہ بن کر رہ گئیں۔ بڑے بڑے قومی ہیرو اور جاں نثاران وطن اپنی نام و ناموس گم کر چکے تھے اور جن علاقوں نے ان المیوں کا مشاہدہ کیا تھا، وہاں یہ مایوسی زیادہ دکھائی پڑی۔ اس حقیقت کی گواہ خود ۱۸۵۷ء کے بعد لمبی مدت تک انگریزوں کے خلاف کسی آواز کا نہ اٹھنا ہے۔ جس بے دردی اور پلان کے ساتھ سماج میں سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کا صفایا کیا گیا، اس صدمے سے نکلنے میں ہندوستانی سماج کی دو پیڑھیاں نکل گئیں۔ انگریزوں نے نہ صرف جان و مال پر حملے کیے اور تباہی کا بازار گرم کیا، بلکہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی تاریخ کو بھی مسخ کرنے کی بھرپور کوششیں کیں اور انہیں بڑی کامیابی بھی ملی۔ ہندوستانیوں اور ان کے رہنماؤں کے بارے میں بھدے لٹریچر تیار کیے گئے، افواہوں کا بازار گرم کیا گیا، ایک دوسرے کے خلاف نفرت بھری باتیں پھیلائی گئیں اور اس طرح پورے سماج اور ملک کو بانٹنے کے لیے نفرت کے بیج بوئے گئے۔ آج اس واقعہ کے ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی دانشوروں، مورخوں کا بڑا طبقہ ہندوستانی منابع کی مدد سے اس تاریخ کو لکھنے میں ناکام نظر آتا ہے۔

رہی بات ۱۸۵۷ء کے جنگ کے اثرات کی اور خاص طور پر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی پر، تو یہ بات طے ہے کہ اگرچہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد ایک طویل مدت تک انگریزوں کے خلاف کوئی بڑا واقعہ یا بغاوت کی کوئی بڑی کوشش نہیں ہو سکی اور لوگوں کے ذہنوں پر برٹش حکومت کی دھاک اور دہشت بیٹھ گئی، لیکن وفاداری اور محبت، قوت اور جبر واکراہ سے حاصل نہیں کی جا سکتی، اسی لیے عوام اور حکومت میں روز بروز غیریت اور نفرت بڑھتی گئی، جو بعد میں عوامی تحریکوں کی شکل میں رونما ہوئی، جیسے علی برادران، علمائے ہند، تلک، جناح، مولانا آزاد، گاندھی، عبدالغفار خاں، نہرو، حسرت موہانی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، سیف الدین کچلو، لالہ لاجپت رائے، مظہر الحق، سید محمود، راجندر پرشاد، بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خاں، چندر شیکھر آزاد جیسے لوگوں کی رہنمائی ملی اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں برٹش سامراج کے خاتمہ اور ہندوستان کی آزادی کا سبب بنی۔

آج جب ہم ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰ ویں سالگرہ منا رہے ہیں تو ہمیں اس پوری تاریخ کو اپنی نظر میں رکھ کر ملک وقوم کی بھلائی اور اتحاد کے لیے کوشش کرنی چاہئے اور ساتھ ان تاریخی واقعات سے سبق لینا چاہئے۔ یہی ہمارا فرض بھی ہے اور ان شہیدوں کو ہماری سچی خراج عقیدت بھی! ☆☆

> "انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کا سبب اس کا منظم نہ ہونا ہے، چنانچہ انقلابی صفوں میں انتشار تھا، جبکہ انگریز مکمل نظم وضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے، نیز انقلابیوں کے سامنے کوئی واضح اور مشترک ایجنڈا بھی نہ تھا"
>
> ——— **ڈاکٹر امجد رضا امجد**☆

۱۸۵۷ء کی انقلابی جدوجہد جسے غدر، بغاوت، فوجی یورش اور دبے لفظوں میں تحریک آزادی کا نام دیا گیا، دراصل محکوم ہندوستان کی وہ سیاسی وسماجی تاریخ ہے، جس نے ہندی اقوام کے اندر حریت کی روح پھونکی، جس کے بطن سے انقلاب کے نہ ختم ہونے والے سلسلے شروع ہوئے اور جو ۹۰ سال بعد بالآخر آزادی کی شکل میں اپنے نقطۂ کمال تک پہنچ گئی ——— یہ حقیقت ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء میں مجاہدین حریت نے انقلاب کا علم بلند نہیں کیا ہوتا تو ۱۹۴۷ء میں ملنے والی آزادی بھی ہمارے لئے خواب ہوتی۔ یہ وہ تاریخی انقلاب تھا جس نے غاصب حکمراں کے وجود نامسعود کو متزلزل اور ہوس اقتدار کو مجروح کر دیا تھا، چنانچہ لندن ٹائمز کے نامہ نگار کو اس انقلاب کی شدت وہمہ گیریت کو دیکھ کر لکھنا پڑا کہ "انگریزوں کو ہندوستان دوبارہ فتح کرنا پڑا۔" (جدید ہندوستان ص ۱۴۸) ——— ہندی مورخین نے اسی وجہ سے ۱۸۵۷ کی تحریک کو آزادی کا "سنگ میل" اور "خشت اول" قرار دیا ہے۔ چنانچہ مشہور مورخ بپن چندرا نے لکھا

"۱۸۵۹ء تک برطانوی اقتدار ہندوستان پر دوبارہ قائم ہو چکا تھا لیکن بغاوت بے فائدہ نہیں رہی تھی، ہماری تاریخ میں وہ ایک شاندار سنگ میل ہے اگر چہ قدیم طریقوں سے اور روایتی قیادت کے تحت ہندوستان کو بچانے کی وہ ایک جان پر کھیل جانے والی کوشش تھی تاہم ہندوستان کو برطانوی سامراج سے نجات دلانے کی وہ پہلی عظیم کوشش بھی تھی۔ اسی نے جدید قومی تحریک کے لئے راہ ہموار کی۔ ۱۸۵۷ کی قوم پرستانہ اور بہادرانہ جدوجہد نے ہندوستانی عوام کے ذہنوں پر ایک ناقابل فراموش نقش چھوڑا اور آگے آنے والی جدوجہد آزادی کے لئے ایک مستقل سرچشمہ بن گئی۔" (جدید ہندوستان ص ۱۵۶)

مشہور تاریخ داں ڈاکٹر تاراچند کی بھی یہ بات قابل ملاحظہ ہے "۱۸۵۷ کی آگ دب گئی لیکن اس کی چنگاریاں خاموش نہیں ہوئی، دراصل یہ اسی وقت کے بوئے ہوئے بیج کا درخت ہے جو ۱۹۴۷ء میں پھل لایا۔" ——— ایک دوسرے مورخ ڈاکٹر آر سی موزمدار تو اس سے بھی بڑی بات کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں

"۱۸۵۷ کی شورش ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لئے وسیع پیمانے پر پہلی بڑی اور براہ راست چنوتی کی حیثیت سے ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ نصف صدی بعد شروع ہونے والی آزادی کی تحریک کو اسی تحریک سے روشنی ملی۔ ۱۸۵۷/۱۸۵۸ کی یاد نے ہماری آزادی کی تاریخ کو تقویت دی، اس کے مجاہدین کے دلوں میں ہمت کی روح پھونکی، خوفناک جدوجہد کے لئے ایک تاریخی بنیاد فراہم کی۔ اور اسے ایک ایسا اخلاقی محرک عطا کیا جس کی وقعت میں مبالغہ کرنا ممکن نہیں۔ ۱۸۵۷ کی بغاوت کی یاد نے، جس کی عظمت غلط بیانیوں کے باوجود بڑھتی گئی، ہندوستان میں برطانوی حکومت کے مفاد کو نقصان پہنچایا، اتنا خود بغاوت سے بھی نہ پہنچا ہوگا"۔

اگر تاریخی واقعات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہندوستانیوں کی غیرت حریت کو زندہ کر دیا اور وہ اضطراب واشتعال کے نشہ میں چور چور ہو گئے۔ چنانچہ رولٹ کمیٹی کی سرکاری رپورٹ کے مطابق

"متعدد جگہوں پر بغاوت کے لیے ہتھیار اور آتش گیر مادے بنائے گئے، باغیانہ لٹریچر تقسیم کیا گیا، فوجیوں کو ملازمت چھوڑنے اور بغاوت کرنے کی ترغیب دی گئی، امریکہ میں غدر پارٹی قائم ہوئی، غدر کے نام سے اخبار نکالا گیا، جس میں خفیہ جماعت بنانے کی تلقین کی جاتی، اشتعال انگیز نظموں کا مجموعہ شائع ہوتا، اس طرح امریکہ سے لیکر فلپائن، ملایا، ہانگ کانگ، سنگاپور، چین، مصر وترکی اور افغانستان وغیرہ میں یہ انقلابی جماعتیں پھیلی ہوئی تھیں۔" (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۵۴۳)

یہی وجہ ہے کہ ہر سال بغاوت کی سالگرہ منانے کے ساتھ اعلیٰ سطح پر ۱۸۵۷ کی تحریک آزادی کی جبلی منائی گئی، سرکاری سطح پر سو سالہ جشن منایا گیا اور اب ڈیڑھ سو سالہ یاد منائی جارہی ہے ——— یادگار قائم رکھنے کا یہ تسلسل اس بات کی علامت ہے کہ ۱۸۵۷ کی انقلابی جدوجہد کو پہلی جنگ

☆Editor Quarterly"Refaqat"Sultanganj(Bihar)

آزادی کے طور پر ہمیشہ زندہ رکھا گیا اور ۱۹۴۷ء میں اس کے مثبت اثرات آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے آئے۔

تحریک آزادی کے ۹۰/سال بعد ملنے والی اس کامیابی کے باوجود، یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کہ آزادی کی وہ تحریک جس کی وسعت" شمال میں "پنجاب" سے جنوب میں "نرملا" تک اور مشرق میں "بہار" سے مغرب میں "راجپوتانہ" (جدید ہندوستان، بپن چندرا ص ۱۴۱) تک پھیلی ہوئی تھی، اپنے عہد میں ناکام کیوں: ہوئی، اس سلسلے میں مؤرخین کے مختلف نظریات ہیں چنانچہ ڈاکٹر تاراچندر کے بقول "ناکامی کا سبب قومیت کے جذبے کا فقدان، علم وصنعت یعنی سائنس اور تکنیک کی کمی تھا" (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۹)

خورشید مصطفےٰ رضوی نے ناکامی کا سبب، تنظیم کی کمی، اتحاد کا فقدان اور وسائل کی قلت قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"تحریک پوری طرح منظم نہ تھی، انقلابی صفوں میں انتشار تھا، جب کہ انگریز مکمل نظم وضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انقلابیوں کے سامنے کوئی واضح اور مشترک تعمیری پروگرام نہ تھا، صرف انگریزوں کی دشمنی کے جذبات پورے عروج پر تھے، ذرائع خبر رسانی اور نقل وحمل پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ چنانچہ دہلی میں بغاوت کی اطلاع فوراً ایک انگریز نے جان پر کھیل کر "انبالے" کو دے دی اور وہاں سے تمام جگہوں پر پہنچا دی گئی، جس کی وجہ سے انگریزی فوجوں نے تیاریاں شروع کر دیں اور دہلی پر ٹوٹ پڑیں اسی وجہ سے رابرٹ منٹگمری نے کہا تھا کہ "ہندوستان کو تار برقی نے بچا لیا۔ (جنگ آزادی ۱۸۵۷)

مشہور مورخ "بپن چندرا" نے ناکامی کے ایک اور رخ سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھا:

"ہندو ریاستوں میں بیشتر حکمراں اور زمینداروں نے جو خود غرض اور برطانوی طاقت سے خائف تھے، بغاوت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا، گوالیار کے سندھیا، اندور کے ہولکر، نظام حیدرآباد، جودھپور کے راجا اور راجپوتانہ کے دوسرے راجاؤں، نواب بھوپال، پٹیالہ، نابھا، کشمیر کے حکمراں، نیپال کے راجا، دوسرے بہت سے سرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں نے بغاوت کو کچلنے میں سرگرمی سے انگریزوں کی مدد کی حقیقت یہ ہے کہ ایک فیصدی سے زیادہ ہندوستانی سرداروں نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا۔ آگے چل کر گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے کہا تھا کہ ان ہندوستانی حکمرانوں اور سرداروں نے اس طوفان میں پشتے کا کام کیا ورنہ اس کی موجیں ہمیں بہا ہی لے جاتیں" (جدید ہندوستان ص ۱۵۲)

یہاں ایک بات اور بھی قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ تحریک آزادی کے اس عہد میں جہاں ایک طرف علامہ فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، امام بخش صہبائی وغیرہ نے آزادی کے لئے فضا ہموار کی، اس عہد میں دوسری طرف شاہ اسمٰعیل دہلوی، سید احمد بریلوی اور ان کے رفقاء تھے جن کی انگریز دوستی اور حمایتی بیانات وفتاویٰ نے اس اتحاد کو نقصان پہنچایا، آزادی کی کامیابی کے لئے جس کی ضرورت تھی۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ناکامی کے اسباب میں ایک سبب "وہابی تحریک" کے پیشوا بھی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی انداز میں ملوث ہیں۔ رہ گئی ۱۸۵۷ کی تحریک آزادی میں "وہابی علماء" کی شرکت کی بات، تو اس سلسلہ میں "سین" اور آر سی موزمدار جیسے چوٹی کے مورخین نے واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی انقلابی جدوجہد میں وہابی علماء نے شرکت نہیں کی (جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء ص ۱۱) خود شاہ اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی کے سوانح نگاروں نے بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے جیسا کہ مولانا منظور نعمانی کے اس بیان سے ظاہر ہے۔

"مشہور یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا، بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں ان کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی۔" (الفرقان کا شہید نمبر ص ۷۸)

۱۸۵۷ کی تحریک آزادی میں بہادر شاہ ظفر کی شخصیت عوام وخواص سب کے لئے مرکز توجہ رہی کہ سب کچھ لٹ چکنے کے بعد بھی اس مغل بادشاہ سے ملک کے اکثریتی طبقہ کا تعلق عقیدۃً ہی سہی مگر بادشاہ اور رعایا کا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کے خلاف میرٹھ کی افواج نے جب بغاوت کا اعلان کیا تو یہاں سے وہ سیدھے دہلی پہنچیں، اور یہ استغاثہ پیش کیا:

"حضور بادشاہ سلامت! آپ دین ودنیا کے بادشاہ ہیں، آپ کو حق تعالیٰ نے ۲۲ صوبوں کا مالک کیا ہے، تمام ہندوستان آپ کا محکوم اور فرماں بردار ہے، ہندوستان کی رعیت آپ کی رعیت میں شمار ہوتی ہے۔ آج تک ہندوستان میں منادی پھرتی ہے تو یہی بیان کیا جاتا ہے، خلقت خدا کی،

ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی کا، انگریز لوگ آپ کی طرف سے مالک ومختار ہیں، ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں۔'' (بہادر شاہ ظفر ایک مطالعہ ۱۱۰)

بہادر شاہ نے اپنی پیرانہ سالی اور ضعف وناتوانی کے باوجود اپنی رعایا کو مایوس نہیں کیا بلکہ اس تحریک میں عملاً حصہ لیتے ہوئے اپنی بادشاہت، اپنی اولاد اور قید وبند کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے اپنی جان تک نثار کردی——بادشاہ کے جوش جہاد اور جذبہ آزادی کا اندازہ اس کی شاعری سے بھی ملتا ہے، چنانچہ اس تعلق سے یہاں اس کے دو قطعے ملاحظہ کریں

عید ہر سال تمہیں تہنیت آمیز رہے غرق خوں جان عدو خنجر خوں ریز رہے
قتل کفار ہوں اور فتح مبارک ہو ظفر نام کو بھی نہ جہاں میں سر انگریز رہے

یکم اگست ۱۸۵۷ کو جنرل بخت خاں سپہ سالار افواج کو لکھا۔

لشکر اعداء الٰہی آج سارا قتل ہو گورا گورے سے تا گوجر نصاریٰ قتل ہو
آج کا دن عید قرباں کا جبھی جانیں گے ہم اے ظفر تہہ تیغ جب قاتل تمہارا قتل ہو

(جنگ آزادی اور ۱۸۵۷ خورشید مصطفےٰ رضوی ص ۵۵۵/۵۶۰)

اس ہنگامی صورت میں بادشاہ نے جس طرح اس تحریک آزادی میں حصہ لیا اور ہنگامے پر قابو پانے نیز انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے جیسے جیسے اقدامات کئے اس سے ان کے سیاسی تدبر اور عزم وحوصلہ کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ بادشاہ کا (۱) اپنی حالت اور انقلابیوں کے اندر قوت مدافعت نہ دیکھتے ہوئے اس وقت بغاوت سے روکنا۔ (بہادر شاہ ظفر ایک مطالعہ ۱۱۱)

(۲) حالات کو دیکھتے ہوئے جنگ کے لئے آمادہ ہونا اور ہندوستانی دیگر حکمراں کو اور ریاستوں کو برطانوی ریاست کی برخواستگی کے لئے ایک ''وفاق'' بنانے کا تاکیدی خط لکھنا (بہادر شاہ ظفر ایک مطالعہ ص ۱۱۷)

(۳) شہری اور فوجی بدامنی روکنے کے لئے ایک کورٹ بنانا جس کے دس ممبر تھے، ان سے ۶ فوجی نظم ونسق کے نمائندے تھے اور چار شہری (بہادر شاہ ظفر ایک مطالعہ ص ۱۱۳)

(۴) جنگ کے دوران اہل دہلی کے اندر پھوٹ ڈالنے کی انگریزی چال کو ناکام بنانے کے لئے ذبیحۂ گاؤ پر پابندی عائد کرنا (جنگ آزادی اور ۱۸۵۷ خورشید مصطفےٰ رضوی ص ۱۹۰)

(۵) شہر میں امن وامان برقرار رکھنے کی غرض سے بوڑھے بادشاہ کا خود ہاتھی پر سوار ہوکر معائنہ کے لئے نکلنا بعض کے گھر جاکر انہیں صبر کی تلقین کرنا (۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامہ ص ۱۲۳)

(۶) بعض حالات کی بنیاد پر بادشاہ کا اپنے بیٹے کی گرفتاری کا حکم دینا (۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامہ)

(۷) فوج کی تنخواہ کے لئے گھر کے چاندی کے ظروف اور بیگم کے زیورات فروخت کرنا (جنگ آزادی اور ۱۸۵۷ خورشید مصطفےٰ رضوی ص ۲۱۴)

اس کے حسن تدبر، جوش وجذبہ اور عزم وحوصلہ کا واضح ثبوت ہے اسی لئے اہل علم وادب نے بھی بادشاہ کے سیاسی تدبر کا مثبت انداز میں تذکرہ کیا ہے چنانچہ پروفیسر ولی الحق انصاری نے لکھا ہے:

''بہت سے کاغذات جو مقدمے میں پیش ہوئے تھے، ان کاغذات میں بہت سے ایسے ہیں جو ان کی بیدار مغزی اور رعایا پروری کا ثبوت دیتے ہیں ان کے بہت سے احکام وہ ہیں جو انہوں نے مرزا مغل یا دوسرے سرداروں کو رعایا کی فلاح وبہبود اور لٹیروں کے ساتھ سختی سے نپٹنے کے لئے جاری کیے تھے (بہادر شاہ مطالعہ ص ۱۷۱) انہوں نے دوسری جگہ لکھا ہے بیاسی سال کی عمر میں اس قسم کے احکام بادشاہ کی بیدار مغزی اور انتظامی صلاحیت کی گواہی دیتے ہیں جس کا اعتراف بادشاہ کے جانی دشمن جان لارنس چیف کمشنر پنجاب کو بھی کرنا پڑا''۔

☆☆☆

اظہارِ خیالات

اس کالم میں آپ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی اور ملی کسی بھی مسئلہ پر اپنی فکر اور اپنے خیال کا برملا اظہار اور بے لاگ تبصرہ کر سکتے ہیں جو ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جائے گا، واضح ہو کہ اس سلسلے میں آپ کی تحریر مختصر اور جامع ہونی چاہیے ....(ادارہ)

انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا چہرہ کیوں مسخ ہوا؟

محمد اسلم رضا قادری

مدرسہ اسلامیہ رحمانیہ، صدر بازار، باسنی، ناگور (راجستھان)

جناب خوشتر نورانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ سب سے پہلے "جنگ آزادی" کی مناسبت پر "جام نور دہلی" کے خصوصی شمارہ کی اشاعت پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

یہ امر ہر اس شخص پر عیاں ہے جو منصف مزاج اور صالح فکر کا حامل ہوگا کہ جنگ آزادی میں ہمارے علماء کا اہم رول رہا ہے اور انہی مقدس نفوس و ذوات نے مردان ہند کے جذبوں وولولوں کی لاج رکھ کر محب وطن ہونے کے ایسے ایسے واقعات و شواہد فراہم کیے ہیں جو آج بھی ہماری تاریخ کا ایک روشن باب بن سکتے ہیں مگر ہمارے حریف کا برا ہو کہ اس نے محبان وطن کو غدار اور عیاروں، مکاروں کو وفادار بنا کر پیش کیا۔ تاریخ سازی و تاریخ گری میں حقائق پر پردہ ڈال کر مجاز کو حقیقت ثابت کر کے عقیدت میں تاریخ کا وہ خون کیا گیا جسے پڑھ کر کف افسوس ملنا پڑتا ہے کہ آخر ہمارے محققین نے تاریخ کے اس اہم باب کی طرف اپنی تمام تر توجہات کو مبذول کیوں نہیں کیا؟ اور اس محاذ پر صداقت و حقانیت پر مبنی تحریریں کیوں نہیں پیش کی گئیں؟ تاکہ یہ بات بھی آفتاب نیم روز کی مانند ظاہر ہو جاتی کہ "جنگ آزادی" میں جن اکابر علماء اہل سنت نے ایثار و قربانی کی جو روایت رقم کی ہے وہ وطن کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز تر جانتے تھے۔ ملک و وطن کی محبت ان کے رگ و پے میں رچی بسی تھی۔ یہی حقیقت ہے۔ اب جو نام نہاد مؤرخین اس حقیقت کی پردہ پوشی کرتے ہوئے اپنے آپ کو محب وطن ثابت کرنے کے درپے ہیں وہ اصل میں انگریزوں کے حامی، مبلغ تھے۔ جس پر تاریخ کے زریں اوراق شاہد عدل ہیں۔

اس لیے ضرورت ہے کہ ہمارے ارباب فکر و نظر، اصحاب لوح و قلم اس جانب بھی ایک نظر فرما کر حقائق و شواہد کا جائزہ لے کر آنے والی نسل مسلم کو یہ باور کرائیں کہ ہم نے اور ہمارے علماء اہل سنت نے ہی وطن کے وفادار بن کر انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور تاریخ کے ان اوراق کو بھی قوم و ملت کے روبرو رکھیں جن میں ان مجاہدین آزادی کے اخلاص و وفا، جذبۂ فداکاری و وفاداری کے انمول نقوش مرقوم ہیں۔ تاکہ یہ عظیم و لاجواب سرمایہ نذر خاک نہ ہو جائے۔ اسی فکر و احساس کو مفکر اسلام حضرت مولانا یسین اختر مصباحی صاحب قبلہ ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں "آپ حضرات اور ہماری سب کی ذمہ داری ہے کہ صحیح تاریخ دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتلائیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت ہم نے کی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے خون کے قطرات ہم نے بہائے ہیں۔ میدان جنگ میں ہندوستان کے مقابلے کی جب بھی ضرورت پیش آئی تو ہم نے اپنا سینہ پیش کیا۔ اگر کوئی نام نہاد مورخ ہماری خدمات اور قربانیوں کو نظر انداز کرتا ہے، تاریخ بدلتا ہے، تاریخ کا چہرہ مسخ کرتا ہے، تو یہ اس کی بدبختی ہے اور تاریخ کے ساتھ وہ انصاف نہیں کرتا ہے بلکہ تاریخ کے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی پوری تاریخ ہمارے علماء اہل سنت کی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے، دلی سے لے کر روہیل کھنڈ تک، روہیل کھنڈ سے لے کر لکھنؤ تک" (ماہنامہ کنزالایمان ص: ۴۳ جون ۲۰۰۷ء) قبلہ موصوف مزید لکھتے ہیں "پورے دو سو سال کی تاریخ لکھی گئی ہے کہ علماء اہل سنت کے کردار کو فراموش کرنے یا داغدار بنانے کی کوشش کی گئی ہے، اب

ہمارا آپ کا فرض ہے کہ اس تاریخ کو درست کریں۔ سب سے پہلے تاریخ کو سمجھیں سمجھائیں، پوچھیں تحقیق کریں اور اس کے بعد اس تاریخ کو درست کریں اور دنیا کے سامنے پیش کریں کہ ہم یہ ہیں، ہمارا یہ کام ہے" (ص ۲۵)

دور حاضر میں جس طرح اغیار نے تاریخ نویسی پر اپنا پہرہ بٹھا کر اپنے حریف طبقے کی علمی و دینی شخصیات کی خدمات جلیلہ کو مجروح و مطعون کیا وہ قابل افسوس ہے۔ لہٰذا اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ہم بھی اس میدان میں پیش رفت کریں تاکہ ہمارا یہ اثاثہ محفوظ ہو سکے۔ اگر اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے مجالس سجاتے رہے اور ایک دوسرے کی طعن و تشنیع میں مصروف عمل رہے تو پھر لکھو دی حقیقی تاریخ! حضرت ڈاکٹر خواجہ اکرام صاحب بہت ہی فکری بات لکھتے ہیں "۱۷۵۷–۱۸۵۷ تک اور ۱۹۴۷ء تک کی تاریخی سچائیوں کو کھنگالنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوگا کہ اس طویل تاریخی جنگ میں جس طرح علمائے کرام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اس طرح کسی اور مذہبی شخصیات نے وہ کردار ادا نہیں کیا، ایک طویل فہرست ہے جس کے لیے کئی دفاتر کی ضرورت ہے لیکن جس طرح دوسروں نے ہماری قربانیوں اور وطن پر جاں نثاریوں کو بھلا دیا اس سے زیادہ ہم نے بھی غفلت کا ثبوت دیا ہے۔ ایک اور پہلو پر غور کریں کہ تاریخ نویس اتمام حجت کے لیے اگر علما کا نام لیتے بھی ہیں تو وہ وہابی تحریک سے شروع کرتے ہیں اور وہیں ختم کر دیتے ہیں جو تاریخ کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے" (جنگ آزادی اور وطن کے جانباز ص ۱۲) حضرت مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب ایک تاریخی پہلو پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "سرسید نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں صراحت کے ساتھ تحریر کیا ہے، اسی طرح "مقالات سرسید" حصہ شانزدہم کے حاشیہ میں صاف لکھا ہوا ہے کہ انگریز کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے وہ سب کے سب علماء کرام شامل تھے جو سید احمد رائے بریلوی و شاہ اسماعیل کے شدید ترین مسلکی مخالف تھے" (ماہنامہ کنز الایمان دہلی ص ۲۶، جون ۲۰۰۷ء) الحاصل تمام تر حقائق و شواہد اسی پر دال ہیں کہ "جنگ آزادی" کے ہیرو اور مجاہد علماء اہل سنت کا مبارک گروہ ہی ہے کوئی اور نہیں! امید کہ "جام نور" دہلی کی فکری اور تحقیقی نگارشات قوم کو اس کا حقیقی و مصنوعی چہرہ دکھائیں اور تعصب پرست حضرات پر یہ بات روشن ہو جائے کہ "جنگ آزادی" کے مابین مسلمانوں کی قیادت و رہنمائی میں جن شخصیتوں کا اہم کردار رہا وہ اجلۂ علمائے اہل سنت ہیں کوئی دوسرا نہیں"۔

انقلاب ۱۸۵۷ء پر خصوصی شمارہ بروقت اقدام ہے

غلام مصطفی قادری رضوی

گلی رحمت عالم، باسنی، ناگور، راجستھان

انقلاب ۱۸۵۷ء کا تصور کرتے ہی قلب و ذہن میں ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اس جنگ آزادی کا سبب بیان کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری لکھتے ہیں۔

"انگریزوں کا عمل دخل تو پورے برصغیر میں ہو چکا تھا لیکن ان کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ انگریزوں نے بندوقوں کے کارتوسوں پر گائے کی چربی اور سور کی چربی لگائی، سور مسلمانوں کے ہاں حرام ہے اور گائے ہندوؤں کے ہاں۔ چونکہ یہ کارتوس منہ لگائے بغیر بندوقوں سے نہیں نکالے جا سکتے تھے، اس لیے اس افواہ نے ہندو اور مسلمان دونوں فوجیوں کو چراغ پا کر دیا اور اچانک بغاوت پھوٹ پڑی، جس کا مرکز دہلی بنا، کیوں کہ بادشاہ کا پایہ تخت رہا تھا، عوام الناس انگریزوں کی عمل داری سے پہلے ہی ناراض تھے وہ بھی فوجیوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس ہنگامی دور میں علامہ فضل حق خیرآبادی نے بہادر شاہ ظفر اور مجاہدین کو انگریزوں کے خلاف بھرپور جنگ کے لئے ابھارا، علما نے جہاد کا فتویٰ جاری کیا، فتوے سے ایک شورش برپا ہو گئی، فتویٰ جہاد ۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء کو صادق الاخبار، دہلی میں چھپا"۔ (جنگ آزادی میں علامہ فضل حق خیرآبادی کا کردار ص ۲۶-۲۷)

حقیقت چھپائے نہیں چھپتی، وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے، جنگ آزادی میں علمائے اہل سنت نے جو قربانیاں پیش کیں، وہ ناقابل فراموش ہیں، ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے پورا برصغیر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور ان کو حقارت و نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگا، آج ہمارا مخالف طبقہ جہاد آزادی میں اپنے پیشواؤں کے کردار کو بڑے مبالغے کے ساتھ پیش کرتا ہے اور انہیں مجاہد و بطل حریت جیسے القاب دے کر عوام کو باور کرا رہا ہے کہ یہی حضرات وطن کے جانباز تھے، جبکہ حقیقت کچھ اور ہے، جس کا اندازہ جام نور دہلی کے اس خصوصی شمارے سے بخوبی لگایا جا سکے گا۔

ماہنامہ جام نور دہلی نے گزشتہ کئی سالوں سے فکری بیداری کی جو تحریک چلائی ہے اس میں دن بدن کامیابی نصیب ہو رہی ہے، خواب خرگوش کا مزا لینے والی قوم اب بیدار ہو رہی ہے، وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھ بھی رہی ہے اور اس کے مطابق اپنا علمی اور عملی سفر آگے بڑھا بھی رہی ہے۔ ملت کی زلف برہم کو سنوارنے میں رسالہ مذکورہ کا اہم رول رہا ہے، محب مکرم مولانا محمد خوشتر نورانی بیدار مغز صحافی ہیں جو حالات کے پیش نظر نت نئے موضوعات پر لکھتے اور لکھواتے رہتے ہیں۔ ان کے قلم سے نکلنے والے اداریے فکر انگیز ہوتے ہیں اور قوم مسلم کو جھنجھوڑنے والے بھی۔ جام نور کے دور صحافت میں جو بھی خصوصی شمارے نکلے وہ بھی بروقت صحیح اقدام تھا، ابھی چند ماہ قبل ایک انتہائی اہم موضوع (اجتہاد و تقلید) پر دستاویزی شمارہ نکال کر قارئین کی معلومات میں اضافہ کا موقع دیا گیا اور حقائق سے آگہی بخشی گئی۔

اگست کے شمارہ کو "جنگ آزادی" کے حوالے سے پیش کرنے کا اعلان پڑھ کر دلی مسرت حاصل ہوئی۔ یہ ضرورت تھی کہ آج (جبکہ اس انقلاب کو ڈیڑھ سو سال پورے ہو رہے ہیں، مئی ۱۸۵۷ء کو اس جنگ کا آغاز ہوا تھا) ان سرفروشان وطن کے بے مثال کردار و ایثار کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور انہیں یقین دلایا جائے کہ وطن کی آزادی اور برطانوی سامراج کی شکست و ریخت میں علمائے اہل سنت ہی نے اہم رول ادا کیا ہے نیز اس قیمتی تحفہ کے ذریعے نئی نسل ان مجاہدین آزادی کے مثالی کردار اور ان کی حیات کے نمایاں گوشوں سے آگاہ ہو سکے گی۔

ویسے گزشتہ چند برسوں سے اس موضوع پر کئی تحریریں سامنے آئیں، حقائق کا انکشاف ہوا۔ شکوک و شبہات کے بادل چھنٹے اور امسال بھی متعدد مقالات اور کتاب و رسائل منظر عام پر آئے، ماہنامہ اشرفیہ جنوری ۲۰۰۷ء کا تفصیلی اداریہ، ڈاکٹر مسعود احمد مظہری کی کتاب 'جنگ آزادی میں علامہ فضل حق خیرآبادی کا کردار' اور مولانا عبدالمالک مصباحی کی کتاب "جنگ آزادی اور وطن کے جانباز" وغیرہ۔ امید ہے کہ جام نور کا یہ قیمتی شمارہ بھی حقائق و معلومات کا گلدستہ لے کر قارئین کے مطالعہ کی میز پر آئے گا اور احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دے گا۔

کیا اب ہمیں خامہ تلاشی کا بدل عطا ہو سکتا ہے؟

مولانا سراج الدین ساز

صدر مدرس مدرسہ رضائے حبیب، اڈھنگ دامبول شاہی، جگت سنگھ پور، اڑیسہ

مولانا خوشتر نورانی صاحب! اسلام مسنون۔ آپ کی موقر ادارت سے مرصع ماہنامہ "جام نور" کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ یہ مجلہ بلاشبہ اپنے اندر ایک دنیا سموئے ہوئے ہے، عمدہ مقالے، اچھوتی نگارشات اور معلوماتی مضامین کے علاوہ مذہب کے تعلق سے دنیا بھر کی خبریں اس مجلے سے فراہم ہو جاتی ہیں۔ مجموعی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کا مورخ جب مذہبی صحافت کی تاریخ مرتب کرے گا تو اس کے لیے ماہنامہ "جام نور" کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔

آپ کا اداریہ "علمائے دین کا معاشی استحکام" بے حد پسند آیا، مضمون میں تنقید و تحقیق کا امتزاج ہے، دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا ادب کے لیے مفید ہے۔ وقار احمد عدوی صاحب کا مضمون توجہ طلب ہے۔ اظہار خیالات کے کالم میں ابن القادری صاحب ایک تند فہم ناقد کی شکل میں جلوہ بار نظر آئے۔ بیان کا پس منظر خواہ کتنا ہی درست کیوں نہ ہو لیکن انداز بیان نہایت دل خراش اور پرشوخ جسارت کا حامل ہے، بایں سبب جا بجا ان کی تحریر میں اظہار مقصود سے زیادہ ازالۂ حیثیت عرفی کا عنصر نمایاں ہو گیا ہے، اس سے قطع نظر کہ ادارتی نوٹ کے ذریعہ جام نور کا تنقیدی پیمانہ موصوف کے ہاتھ آ چکا ہے، تحریر کے چند گوشے اب بھی تشنہ رہ جاتے ہیں۔

مولانا اسید الحق صاحب کی تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں۔ (لفظ "صوفی" سب سے پہلے استعمال حضرت حسن بصری کے لیے ہوا) یہاں پر موصوف ہی کا ایک جملہ "یوں ہوتا تو بہتر تھا" مستعار لیتا ہوں کہ (لفظ "صوفی" سب سے پہلے حضرت حسن بصری کے لیے استعمال ہوا) یا (لفظ "صوفی" کا استعمال سب سے پہلے حضرت حسن بصری کے لیے ہوا۔) ہوتا تو بہتر تھا۔

منظومات کے تعلق سے موصوف نے جو کچھ بھی کہا ہے اس سلسلے میں بحث کو طول نہ دے کر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تنقید برائے تضحیک ہو تو تخریبی ہے اور اگر تنقید برائے اصلاح ہو تو یقیناً تعمیری ہے ع تری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو

ہم خوشتر صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ابوالنفیس معینی صاحب کے رخ سے نقاب الٹ کر خامہ تلاش کی جستجو میں صحرا نوردی کرنے والوں کو باؤلا ہونے سے بچالیا- یوں تو مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری صاحب کے تحقیقی مضامین سے آگے احترام کی ہزاروں گردنیں خم ہیں تاہم ان کی خامہ تلاشی کا آسمان اس درجہ بلند تھا کہ مجھ جیسے کم علم اور بے بضاعت کے لیے اس کے کسی ایک گوشہ پر بھی تبصرہ کرنا دشوار گزار مرحلہ ہے- کیا خامہ تلاشی سے بھی دلچسپ کوئی دوسرا نیا کالم ہو سکتا ہے؟

اگر ایسا ہوتا تو بہتر ہوتا

نثار احمد نظامی مصباحی

جامعہ صمدیہ، پھپھوند شریف، اوریا (یوپی)

پہلی بات: ہماری اس تحریر کا مقصد کسی کی دل آزاری ہرگز نہیں، اگر کسی کو کچھ ناگوار معلوم ہو تو ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں-

کسی چیز کو کسی چیز کے مقابلے میں جب بہتر کہا جاتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، کبھی دونوں چیزیں اچھی ہوتی ہیں مگر ان کی اچھائی میں تفاوت ہوتا ہے، جو زیادہ اچھی ہوتی ہے اسے ''بہتر'' کہہ دیا جاتا ہے، اس کی مثال کی حاجت نہیں اور کبھی صرف ایک ہی چیز اچھی ہوتی ہے، دوسری اچھی نہیں ہوتی، اس صورت میں اچھی چیز کو ''بہتر'' کہہ دیا جاتا ہے جیسے مومن کافر سے بہتر ہے- قرآن کریم میں ہے ولعبد مومن خیر من مشرک- لیکن ہمیں جہاں تک علم ہے اس معنی کے اعتبار سے بہتر کا استعمال کم ہوتا ہے اور پہلے معنی میں کثرت سے ہوتا ہے- ہماری اس تحریر میں ''بہتر'' دونوں معنوں میں استعمال ہوگا اور اس کا فیصلہ قارئین کریں گے کہ کہاں کس معنی کے اعتبار سے استعمال ہوا-

بعض وجوہات کی بنا پر ہم ''۷۵رواں'' جام نور پورا نہیں پی سکے، ہاں جتنا پی سکے اس کا تجزیہ حاضر ہے- مولانا خوشتر نورانی لکھتے ہیں:

''فلاں جملہ یوں ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا اور یوں ہوتا تو خوب تر ہوتا، در حقیقت اس کا کوئی پیمانہ نہیں، تنقید میں اس محاکمہ کی کوئی گنجائش نہیں- انسان کی سوچ اور ذہنی سطح الگ الگ ہوتی ہے، کوئی ضروری نہیں کہ آپ کے نزدیک جو بات صحیح اور اچھی ہو وہ دوسروں کو بھی صحیح اور اچھی لگتی ہو''- (جام نور، جولائی ۲۰۰۷ء، ص:۳۵)

لہٰذا قارئین سے گزارش ہے کہ اگر ہماری کوئی بات اپنی سوچ کے خلاف پائیں تو خوشتر صاحب کی یہ سطریں چند بار پڑھ لیں— اور ہم خوشتر صاحب سے بھی گزارش کریں گے کہ آپ کی مندرجہ بالا عبارت میں ''انسان'' کی جگہ ''انسانوں'' یا ''ہر انسان'' ہوتا تو خوشتر ہوتا-

حسب روایت سرورق پر چند سرخیاں درج ہیں، انھیں میں سے ایک ہے ''علماے دین کا معاشی استحکام''- لفظ استحکام میں ''ت'' کے اوپر زبر لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ لفظ استحکام کی جگہ استَحکام ہو گیا- غور کرنے پر پتہ چلا کہ یہ زبر ''ک'' کا ہے جو ''ت'' پر لگ گیا ہے، ویسے اگر یہ ''ک'' کے اوپر ہوتا تو بہتر ہوتا-

وقار احمد صاحب کی چشم کشا تحریر بہت فکر انگیز ہے، اللہ تعالیٰ ان کی ''فکر کو وسعت دوامی دے''-

حضرت مفتی آل مصطفیٰ مصباحی کا مضمون ''حافظ بخاری اور رد وہابیت'' اختتام پذیر ہوا- اس قسم کے اور مضامین کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے وہ اکابر جن کی خدمات پر پردہ پڑا ہوا ہے، وہ منظر عام پر آسکیں، اس سلسلے میں ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے اپنے انٹرویو (جام نور جون ۲۰۰۷ء) میں سوال نمبر ۷ کے جواب میں جو باتیں کہی ہیں وہ صد فی صد درست ہیں، اہل علم و قلم سے ہماری گزارش ہے کہ وہ آگے آئیں اور اپنے اکابر کی خدمات کو دنیا کے سامنے پیش کریں، مقام عبرت ہے کہ جنوں کا نام خرد رکھنے والوں نے اپنے اکابر کی جھوٹی داستانوں کو ''کارنامہ'' بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور ہم ابھی تک اپنے اکابر کے کارناموں سے خود بھی صحیح طور پر واقف نہ ہو سکے-

''اب پھر وہیں پلٹ چلیں جہاں سے چلے تھے''- مفتی صاحب کے مضمون کا عنوان اگر تھوڑے اضافے کے ساتھ ''حافظ بخاری اور رد وہابیت- حق الیقین کی روشنی میں'' ہوتا تو بہتر ہوتا، کیوں کہ حضرت کا تقریباً پورا مضمون حضور حافظ بخاری قدس سرہ کی ایک خدمت ''حق الیقین'' کی روشنی میں ہے، جب کہ رد وہابیت کے تعلق سے حضور حافظ بخاری کی خدمات صرف ''حق الیقین'' ہی میں منحصر نہیں بلکہ بہت وسیع ہیں، جن پر

باقاعدہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اظہار خیالات کے کالم میں ڈاکٹر شرر مصباحی صاحب کے خیالات پڑھے، ان کا ایک جملہ ہے "وہ سفر میں بھی ہوتے ہیں تو ان کے حواس خمسہ ظاہری و باطنی پورے طور پر اپنی ڈیوٹی انجام دیتے رہتے ہیں"۔ اگر "ظاہری و باطنی" کی جگہ "ظاہرہ و باطنہ" ہوتا تو بہتر ہوتا، یا "ظاہری و باطنی" "حواس خمسہ" سے پہلے ہوتا تو بہتر ہوتا۔ پھر اس کے بعد شرر صاحب نے چند "اہم الفاظ" نقل کیے ہیں، اگر موصوف یہ الفاظ نہ لکھتے تو بہتر ہوتا۔

امریکہ سے ابن القادری صاحب نے جون کے شمارہ پر نظر ڈالی ہے، ہم نے بھی ان کے خیالات پر نظر ڈالی ہے، یہ نظر نظر کی بات ہے، ہم جو باتیں کہنا چاہ رہے تھے ان میں سے اکثر باتیں مدیر محترم نے ادارتی نوٹ میں کہہ دی ہیں۔

سب سے پہلے صوفی کسے کہا گیا؟ اس مسئلے میں حضرت عاشق الرسول، بلکہ امام شعرانی کی تحقیق سے ابن القادری صاحب کو اتفاق نہیں، چوں کہ تصوف اور صوفیہ پر ہمارا مطالعہ بہت کم ہے اس لیے ہم اپنے کو اس مسئلے پر خامہ فرسائی کا اہل نہیں سمجھتے، ہم نے سنا ہے کہ حضرت سید علیم اشرف جائسی صاحب کا مطالعہ اس موضوع پر کافی گہرا ہے، اس لیے ہماری رائے یہ ہے کہ اس مسئلے کی تحقیق کے لیے اگر ان سے رجوع کر لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

ٹھوس بنیادوں پر کسی تحقیق سے عدم اتفاق کا حق ہر کسی کو حاصل ہے اس لیے ہم عرض کر دیں کہ حضرت عاشق الرسول علیہ الرحمہ نے (پہلی قسط میں) لکھا ہے "سب سے اول سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (نے) لبید بن ربیعہ کے اس مصرع کی مدح فرما کر اس عقیدہ (وحدۃ الوجود) کی توثیق فرمائی الا کل شئی ماسوا اللہ باطل"۔ (جام نور، جون ۲۰۰۷ء ص: ۱۰)۔ ہمارے ناقص علم کے مطابق سب سے پہلے سرکار دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت لبید کے مصرع کی مدح فرما کر اس عقیدہ کی توثیق فرمائی ہے، صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اصدق کلمۃ قالھا شاعر کلمۃ لبید الا کل شئ ما خلا اللہ باطل (صحیح البخاری، کتاب الادب، باب ما یجوز من الشعر الخ ج ۲ ص ۹۰۸، صحیح مسلم، کتاب الشعر، ج ۲، ص ۲۳۰) اس سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ عقیدۂ وحدۃ الوجود کی بنیاد خلافت راشدہ میں نہیں بلکہ عہد رسالت میں پڑی ہے، اور سب سے پہلے اس عقیدہ کی توثیق حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ حضرت عمر کی توثیق کا ہمیں کچھ علم نہیں، کوئی صاحب علم اگر بتا دیتے تو بہتر ہوتا۔

ابن القادری صاحب بیکل اتساہی صاحب کے درج ذیل دو شعر زیر بحث لائے ہیں اور انہیں اپنی "سمجھ سے بالاتر" قرار دیا ہے، وہ دونوں شعر یہ ہیں

رکھ غلام اپنے خاص بندوں کا　　ساتھ ہی خدمت عوامی دے
مظہر ذات کبریا کے لیے　　فکر کو مدحت گرامی دے

یہ بات ہنوز ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب یہ دونوں شعر ابن القادری صاحب کی سمجھ سے بالاتر ہیں تو انہوں نے ان دونوں شعروں میں تبصرہ کیسے فرما دیا؟ ابن القادری صاحب کو پہلے شعر کا مفہوم واضح نہ ہونے کا شکوہ ہے، اس پر ہمیں حیرت ہے، کیوں کہ اس کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اور موصوف نے "خدمت" سے پہلے لفظ حوصلہ یا جذبہ لگانے کی جو بات کہی ہے، اس سے ہمیں اتفاق نہیں، کیوں کہ اگر اس لفظ کو لگا دیا جائے تو شعر کی معنویت میں کمی آ جائے گی، اس لیے کہ شاعر خدمت عوام کا جذبہ اور حوصلہ نہیں بلکہ "خدمت عوام" مانگ رہا ہے۔ کسی کام کا جذبہ اور حوصلہ ہونا پہلی منزل ہے اور اس کام کو انجام دے دینا دوسری منزل ہے، شاعر خدمت عوام کا جذبہ اور حوصلہ نہیں بلکہ "خدمت عوام" مانگ رہا ہے۔ شاعر خدمت عوام کی انجام دہی یعنی دوسری منزل مانگ رہا ہے، جس سے پہلی منزل کا مطلوب ہونا خود بخود سمجھ میں آ جا رہا ہے، اب اگر شاعر کے شعر میں لفظ حوصلہ یا جذبہ کا اضافہ کر دیا جائے تو شعر کی گہرائی اور وسعت معنوی میں جو فرق آئے گا وہ محتاج بیان نہیں۔

ابن القادری صاحب نے دوسرے شعر کی اصلاح یوں کی ہے "دوسرے شعر کا مصرعہ آخر یوں ہوتا تو بہتر تھا، فکر میں وسعت دوامی دے"۔ اس سے قطع نظر کہ اس اصلاح شدہ مصرع میں "میں" کی جگہ "کو" ہوتا تو بہتر ہوتا، ہم یہ عرض کر دیں کہ ہمارے بعض احباب نے اس اصلاح کو تبدیلی کا نام دیا ہے کیوں کہ شاعر کچھ اور کہنا چاہ رہا ہے اور شعر کی "بہتر صورت" کچھ اور کہہ رہی ہے۔ مضمون کی طوالت کا خوف پیش نظر ہے ورنہ ہم

اس اصلاح شدہ مصرع کے بارے میں اپنے خیالات بہت تفصیل سے لکھتے۔

رضویات کے نامور محقق ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی اور مولانا کوکب نورانی کے سفرنامۂ آسٹریلیا کے تعلق سے ابن القادری صاحب کے خیالات سے ہمیں اتفاق نہیں۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، بس ہم یہی عرض کریں گے کہ دسیوں سال کی شب و روز محنت و مشقت کے بعد اگر کسی نے متعدد کارنامے انجام دیے ہوں تو کیا کسی کے پوچھنے پر اسے کھل کر یہ بتانے کا بھی حق نہیں کہ فلاں فلاں کام ہم نے کیے ہیں؟ ہم ابھی تک یہ نہیں جان سکے کہ ڈاکٹر شمس مصباحی کے انداز اور اسلوب بیان میں تفاخر کہاں ہے؟ کوئی صاحب نشان دہی کر دیتے تو بہتر ہوتا۔ اور رہی بات کسر نفسی کے فقدان کی تو اس کی حقیقت ''گمان'' سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

آخری بات: ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہماری اس تحریر میں بہت سی باتیں ''برائے وزن شعر'' ہیں، ہم نے انہیں اس لیے لکھ دیا ہے تا کہ ہمارے کسی باذوق قاری کو یہ شکوہ نہ رہے کہ ''برائے وزن شعر'' بھی کچھ ہوتا تو بہتر ہوتا۔

ادارتی نوٹ:- غالباً پہلی بار آپ اظہار خیالات کی محفل میں جلوہ بار ہوئے ہیں، کاش آپ یہ سلسلہ قائم رکھتے تو بہتر ہوتا، آپ نے بڑے انکسار اور عمدگی سے کئی بہتر باتیں کر کے ہمیں مبارک باد دینے پر مجبور کر دیا ہے لیکن اگر آپ شرر صاحب کی تحریر میں وارد الفاظ ''حواس خمسہ ظاہری و باطنی'' کو زیر بحث نہیں لاتے تو بہتر ہوتا۔ کیوں کہ مروج اردو میں جمع الفاظ کی فارسی صفت عموماً واحد (ہ کے بغیر) استعمال کی جاتی ہے اور اسے ہی بہتر سمجھا جاتا ہے، مثلاً ''مدارس اسلامیہ'' کی جگہ ''مدارس اسلامی'' اور ''افکار اسلامیہ'' کی جگہ ''افکار اسلامی'' ادیبوں کی تحریروں میں زیادہ استعمال ہے۔ غالباً بوقت تحریر آپ کے ذہن میں عربی گرامر رہا ہوگا، ہمارے خیال میں اگر ایسا نہ ہوتا تو بہتر ہوتا۔

شمارہ جولائی صفحہ نمبر ۳۱/ تا ۳۶/ یوں ہی ضائع ہو گیا

محمد فرحت حسین خوش دل

شعبۂ اردو +۲ ضلع اسکول، ہزاری باغ، جھارکھنڈ

محترمی خوشتر نورانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ ... جام نور شمارہ جولائی ہمدست ہوا۔ اس شمارہ میں معروف نقاد ابوالفیض معینی سے آپ کا مصاحبہ پڑھا، دلچسپی کی حد تک کئی راز کو منکشف کر گیا، مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری صاحب بالغ نظر اور بالیدہ فکر محقق، ناقد اور ادیب ہیں۔ ''جام نور'' کا یہ جانباز قلم کار عرصہ دراز تک ذہن و دل پر چھایا رہے گا۔ ان کا گراں قدر مضمون ''کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟'' کی آخری قسط پڑھ کر بے ساختہ مذکورہ بالا جملہ صفحۂ قرطاس پر آیا۔

''اظہار خیالات'' کے کالم میں ابن القادری صاحب کا مراسلہ پڑھا۔ غیر ضروری تنقیدی مباحث جام نور کا کیا مقدر بن جائے گا؟ پورے مراسلہ کے پڑھنے کے بعد جس مرکزی نکتے پر مجھے افسوس ہوا اس کا جو جواب میں نے سوچا تھا اس کا ہو بہو جواب آپ نے اپنے ادارتی نوٹ میں دے دیا ہے۔ اس لیے میں اس پر تفصیل میں جانے کی بجائے بس یہ عرض کروں گا کہ صفحہ نمبر ۳۱ تا ۳۶ یوں ہی ضائع ہو گیا۔

آپ کا اداریہ اس معنی میں اہم ہے کہ عصر حاضر میں علمائے دین کے معاشی استحکام کی ضرورت پر آپ نے تفصیلی گفتگو کی ہے، ساتھ ہی اس کے تدارک اور اس کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وقار احمد ندوی کا مضمون عالمانہ نوعیت کا ہے تحریری مباحثہ کا کالم مفید ہے۔ مولانا انوار احمد بغدادی نے اپنے خیالات کا اظہار خوب کیا ہے۔ آخری پیراگراف پورے اظہار خیال کا نچوڑ ہے۔

ذیشان احمد مصباحی کا تبصرہ تجزیاتی نوعیت کا ہے۔ مولانا وحید الدین خاں کی اللہ مغفرت کرے۔ موصوف آئے دن ایک نیا شوشہ چھوڑ اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کی بجائے اپنی صورت مسخ کرتے ہیں۔ ☆☆☆

قارئین کرام متوجہ ہوں:- آپ کو ملنے والے رسالے کے لفافے پر (پتے کے اوپر) اس شکل میں 3040/Jan-06-Dec.07 آپ کی ممبری فیس کی مدت لکھی ہوئی ہے، براہ کرم رسالہ پڑھنے سے قبل اسے دیکھ لیں، اگر آپ کی ممبری فیس ختم ہو گئی ہو تو اولین فرصت میں تجدید کرا لیں، ورنہ ہم آپ کو بھی رسالہ بھیجنے سے معذور رہوں گے۔ ادارہ

مفتی آل مصطفیٰ مصباحی☆

شرعی عدالت

اس کالم میں آپ شرعی امور سے متعلق کوئی بھی سوال مفتی صاحب قبلہ کو خط لکھ کر پوچھ سکتے ہیں، آپ کے سوالات اور مفتی صاحب کے جوابات ہر ماہ اس کالم میں شائع ہوا کریں گے۔ شرعی عدالت کے لیے آپ اپنے سوالات اس پتے پر ارسال کریں:-

مفتی آل مصطفیٰ مصباحی، استاذ جامعہ امجدیہ رضویہ، گھوسی ضلع مئو (یوپی)

انقلاب ۱۸۵۷ء کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال :-(۱) سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے مذہبی عقائد و نظریات کیا تھے؟ خصوصاً شیخ ابن عبدالوہاب نجدی کے جو اثرات اس زمانے میں ہندوستان تک پہنچ رہے تھے، سلطان انہیں کس نظر سے دیکھتے تھے؟ (۲) انقلاب ۱۸۵۷ء کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (۳) عہد مغلیہ اور اس کے بعد کے دور میں انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ معاملات، موالات اور مراعات کے حدود و قیود کیا ہیں؟

مستفتی: ———— ادارہ ماہنامہ جام نور دہلی

جواب :-(۱) سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے مذہبی عقائد و نظریات اسلامی تھے اور وہ اہل سنت و جماعت سے تھے، ان کے حالات سے بخوبی واضح ہے کہ وہ بحمدہ تعالیٰ ابن عبدالوہاب نجدی کے گمراہ کن اثرات سے محفوظ تھے۔ اہل سنت و جماعت کے مراسم پر سختی سے عمل پیرا تھے، بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دیا کرتے تھے، فاتحہ اور میلاد پاک کا بھی اہتمام کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہابی عقائد و افکار کی زہریلی ہوا ہندوستان پہنچی اور مولوی اسماعیل دہلوی جو ابن عبدالوہاب نجدی کے افکار کے حامل تھے اور انگریزوں کے کہنے پر مسلمانوں کو لڑانے کے لیے انہوں نے تقویت الایمان نامی کتاب لکھی اور اس میں میلاد، فاتحہ، قیام، نذر وغیرہ کو نہ صرف ناجائز قرار دیا بلکہ انگریز آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے شرک اور مسلمانوں کو مشرک قرار دیا، ٹھیک اسی ماحول میں سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر نے اہل سنت و جماعت کے عقائد و افکار کی حفاظت کے لیے اس وقت کے جلیل القدر عالم دین سیف اللہ المسلول علامہ شاہ فضل رسول بدایونی قادری علیہ الرحمہ کی خدمت میں چند سوالات پر مشتمل ایک طویل استفتاء فارسی زبان میں بھیجا، اختصار کے ساتھ جس کا ترجمہ تعارف مصنف کے حوالے سے "احقاق حق" ص ۱۴، ۱۵ میں یوں درج ہے۔

"سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس شخص کے متعلق جو یہ کہتا ہے کہ دن متعین کر کے محفل میلاد شریف منعقد کرنا گناہ کبیرہ اور محفل مولود شریف میں قیام کرنا شرک ہے اور فاتحہ کرنا طعام و شیرنی پر حرام ہے، اور اولیاء اللہ سے مراد چاہنا شرک ہے اور حسب قدیم ختم میں پانچ آیتوں کا پڑھنا بدعت سیئہ ہے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کا معجزہ حق نہیں ہے اور کہتا ہے کہ تعزیہ کا بالقصد یا بلاقصد دیکھنا کفر ہے اور ہولی دیکھنا اور دسہرے میں سیر کرنا اگرچہ بلا ارادہ ہو تو وہ کافر ہو جائے گا اور اس کی عورت پر طلاق ہو جائے گی اور کعبہ شریف و مدینہ منورہ کے خطہ میں کوئی بزرگی نہیں ہے اس وجہ سے کہ اس زمین میں ظلم ہوا ہے اور سننے میں آیا ہے کہ وہاں کے باشندگان ظالم ہیں۔ مدینہ منورہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کیا اور مکہ معظمہ میں عبداللہ ابن زبیر کو قتل کیا اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ سے باہر کیا ———— پس ایسی صورت میں ان لوگوں کی اقتدا اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا مسلمانوں کو ان سے بیعت ہونا درست ہے یا نہیں؟ اور شرع شریف کا ایسے لوگوں پر کیا حکم ہے اور نیز ان کے متبعین پر کیا حکم ہے؟ - فقط

نقل مہر حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی

بادشاہ دین پناہ وفقہ اللہ لما یحبہ و یرضاہ -

محمد بہادر شاہ، بادشاہ غازی، ابوظفر سراج الدین

حضرت سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول قادری نے پندرہ صفحات میں تفصیل سے جواب لکھا اور مسلک اہل سنت و جماعت کو دلائل سے بیان کیا۔ اس فتویٰ پر اجلہ علماء نے تصدیق و دستخط فرمائے۔

☆Jamia Amjadia Rizvia,Po.Ghosi,Distt Mau(U.P) Phone 05474-222046

بہادر شاہ ظفر کے فکر و عقیدے کو اس جہت سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے علماے حق خصوصاً علامہ فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، وغیرہ کی حمایت و تعاون سے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، جبکہ ابن عبد الوہاب نجدی کے فکر و عقیدے کے حامل مولوی اسماعیل دہلوی، سید احمد رائے بریلوی، میاں نذیر حسین دہلوی، انگریزوں کی وفاداری میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے سخت مخالف تھے۔

پھر یہ کہ جب تک کسی سنی صحیح العقیدہ مسلمان کلمہ گو کی تحریر یا تقریر سے معاذ اللہ کوئی منافی اسلام کلمہ سرزد نہ ہو وہ شرعاً صحیح عقیدے والا مسلمان ہی مانا جائے گا۔ چہ جائیکہ سنیت پر قائم رہنے کے متعدد دلائل موجود بھی ہوں۔ اس لیے سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر ایک سنی صحیح العقیدہ مسلمان تھے اور وہابی عقائد و نظریات کے سخت خلاف تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

جواب (۲) ۱۸۵۷ء کا انقلاب جو مختلف ظاہری و باطنی عوامل کے نتیجے میں رونما ہوا شرعی نقطۂ نگاہ سے مسلمانان ہند کے لیے انگریزوں کے خلاف "جہاد" تھا، وجہ یہ ہے کہ جہاد کے فرض ہونے کے جو شرائط ہیں وہ انگریزوں کے بے پناہ ظلم و ستم اور سفاکیت و حیوانیت کے نتیجے میں پائی جاتی تھیں، باطنی عوامل تو یہ تھے کہ ہندوستانی باشندوں کو نصرانی بنانے کے جامع منصوبے پر انگریزوں نے بڑی ہوشیاری سے اور بڑی تیزی سے عمل شروع کر دیا تھا، انگریز یہ سمجھتے تھے کہ مذہبی بنیادوں پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف خصوصاً مسلمانوں کا، قبضہ و تغلب میں بڑی رکاوٹ ہے اس لیے خاص اسکیم کے تحت سب کو ملحد و بے دین بنا کر ملت نصاریٰ پر قائم کر دیا جائے۔ ہندو سپاہیوں کو گائے کی چربی والی کارتوس اور مسلمان سپاہیوں کو خنزیر کی چربی والی کارتوس منہ سے چھکنے کا حکم دینا الحاد و بے دینی کی راہ پر چلانے کا ایک حصہ تھا۔ مدارس و مکاتب کو مٹانے کی بھرپور کوشش، مسلمانوں کو ختنہ کرنے سے روکنا، پردہ نشیں خواتین پر پردہ ختم کرانے کی اسکیم چلانا، مذہب نصرانیت کے فروغ کی بھرپور کوشش تھی۔

ان عوامل کے نتیجے میں جب ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں نے غم و غصہ اور نفرت کا اظہار کیا تو انگریز درندوں نے عام لوگوں خصوصاً مسلمان، مردوں، عورتوں، جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کو بے دریغ قتل کرتے، ان کی متاع کو لوٹتے، ان کی عزت و ناموس سے کھلواڑ کرنے اور انہیں حراست میں لے کر قتل کرتے، تاریک کوٹھریوں میں قید رکھنے اور دیگر ظلم و ستم ڈھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ (تفصیل کے لیے الصوارم الہندیہ وغیرہ دیکھیے)

فقہی لحاظ سے یہ نفیر عام تھی جس حالت میں ہر ایک پر جہاد اور دفاع واجب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماے حق کے سرخیل، مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان انہیں ناگفتہ حالات کے پیش نظر الور سے دہلی آ گئے اور انگریزوں کے خلاف انقلاب لانے کا عزم رکھنے والوں کی رہنمائی فرمائی۔ پھر جنرل بخت خاں کے دہلی آنے پر فتویٰ جہاد مرتب فرمایا اور بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں جہاد کی اہمیت و ضرورت پر تقریر کی اور جہاد کا فتویٰ پیش کر کے علماء سے دستخط لیے، فتویٰ پر صرف علماے حق اہل سنت و جماعت نے دستخط کیے، علماے سو نے دستخط سے انکار کیا۔ کیوں کہ علماے سو کے قائد امام الوہابیہ مولوی اسماعیل دہلوی، سید احمد رائے بریلوی، میاں نذیر حسین دہلوی، انگریزی حکومت کے ہرگز ہرگز مخالف نہ تھے، اسی لیے انہوں نے کبھی انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا، نہ فتویٰ دیا۔ بلکہ کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے اسماعیل دہلوی نے انگریز گورنمنٹ کی کاسہ لیسی، چاپلوسی اور ان سے نذرانہ وصول کرنے کی خاطر یہاں تک کہہ دیا "ہم پر اپنے مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں" (دیکھیے مقالات سرسید حصہ: نہم، ص ۱۴۲ اور ص ۲۰۷)

یہی وجہ ہے کہ مولوی اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی نے سرحد کے مسلمانوں سے اور سکھوں سے لڑائی کی، نتیجتاً دونوں مارے گئے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ شرعاً یہ جہادی انقلاب تھا، اس میں مرنے والے جو اللہ و رسول جل وعلا و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حقیقی وفادار تھے، انہیں شہادت کا درجہ ملا۔ قرآن کریم میں ہے۔ اذن للذین یقتلون بانهم ظلموا و ان الله علی نصرهم لقدیر ○ الذین اخرجوا من دیارهم بغیر حق ان لوگوں کو جہاد کی اجازت دی گئی جن سے لوگ لڑتے ہیں، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بیشک اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ وہ جن کو ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا۔ اور فرماتا ہے: وقاتلوا الذین فی سبیل الله الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا إن الله یحب المعتدین اور اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ بدائع الصنائع میں ہے: واما بیان کیفیة فرضیة الجهاد فالأمر فیه لا یخلو من أحد وجهین إما إن کان النفیر عاما، وإما إن لم یکن، فان لم یکن النفیر عاماً فهو فرض کفایة، ومعناه أن یفترض علی جمیع من هو أهل

الجهاد لكن إن أقام البعض سقط عن الباقين، وإنما إذا عم النفير بأن هجم العدو على بلد فهو فرض عين يفترض على كل واحد من احاد المسلمين ممن هو قادر عليه (جلد :۶، صفحہ ۵۸، کتاب السیر) واللہ تعالیٰ اعلم۔

جواب (۳):- معاملات دنیویہ جس سے دین میں ضرر نہ ہو، مرتد کے علاوہ سب سے جائز ہے خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا کفار، لہٰذا ان سے خرید وفروخت کر سکتے ہیں، سامان اجارہ پر دے سکتے ہیں- ہدیہ کا لین دین بھی کر سکتے ہیں مگر یہ سب امور اپنے شرائط سے مشروط ہیں جن کا ذکر فقہ کی مختلف کتابوں خصوصاً ''محیط'' میں ہے اور ان سب کا خلاصہ امام احمد رضا قدس سرہٗ نے المحجة المؤتمنة میں ذکر فرمایا ہے- المحجة المؤتمنة میں ہے:

''دنیوی معاملت جس سے دین پر ضرر نہ ہو سوا مرتدین کے کسی سے ممنوع نہیں، ذمی تو معاملت میں مثل مسلم ہے اور غیر ذمی سے بھی خرید وفروخت، اجارہ، استجارہ، ہبہ، استیہاب بشروطہا جائز وخریدنا مطلقاً ہر مال کا کہ مسلمان کے حق میں متقوم ہو اور بیچنا ہر جائز چیز کا جس میں اعانت حرب یا اہانت اسلام نہ ہو، اسے نوکر رکھنا جس میں کوئی کام خلاف شرع نہ ہو، اس کی جائز نوکری کرنا جس میں مسلم پر اس کا استیلاء نہ ہو، ایسے ہی امور میں اجرت پر اس سے کام لینا یا اس کا کام کرنا، مصلحت شرعی سے ہدیہ دینا جس میں کسی کفر کا اعزاز نہ ہو، اس کا ہدیہ قبول کرنا جس سے دین پر اعتراض نہ ہو، وہ صلح کی طرف جھکے تو مصالحت کرنا، مگر وہ صلح کہ حلال کو حرام کرے یا حرام کو حلال (ص ۱۳)

حاصل یہ کہ محض معاملات مرتد کے سوا ہر کافر سے جائز ہے جب تک کسی محظور شرعی کی طرف منجر نہ ہو- رہی مراعات اور نرمی کی بات تو دین میں مخالف کے ساتھ یہ چیزیں روا ہیں، جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے الا ان يكون الكفار عليهم ظاهرين اولياء فيظهرون لهم اللطف ويخالفونهم في الدين و ذلك قوله تعالىٰ إلا ان يتقوا منهم تقىة (رواہ ابوحاتم وابن منذر)

اسی کو موالات صوریہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں- رہے معاملات حقیقیہ تو یہ مطلقاً حرام ہے، جس کی ممانعت نص قطعی سے ثابت قال الله تعالى ولا تركنوا الى الذين ظلموا فتمسكم النار ظالموں کی طرف میل نہ کرو کہ تمہیں آگ چھوئے- واللہ تعالیٰ اعلم

☆☆☆

دیار صابر پاک میں علم وادب کا عظیم مرکز

دارالعلوم قادریہ صابریہ برکات رضا

پیران کلیر، روڑکی، اترانچل

جہاں گزشتہ ۵ سالوں سے اعدادیہ تا ثالثہ اور حفظ قرآن مع تجوید کی تعلیم ماہر اور مشفق اساتذہ کے زیر سایہ دی جا رہی ہے- اس سال سے جماعت رابعہ کی تعلیم کا بھی آغاز ہوگا- ادارہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں طلبہ کی دینی تعلیم کے ساتھ اسلامی تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے- علاوہ اس کے درس نظامی کے ساتھ ساتھ ابتدائی انگریزی اور کمپیوٹر کی تعلیم کا بھی انتظام ہے- داخلہ کے خواہش مند طلبہ اپنی درخواست ۳۰ر شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ/۱۳ر ستمبر ۲۰۰۷ء بصدر المدرسین کے نام بھیج دیں- ۱۱ر ۱۲ر ۱۳ر شوال تک داخلہ کی کارروائی جاری رہے گی-

رابطہ کا پتہ: دارالعلوم قادریہ صابریہ برکات رضا

پیران کلیر پوسٹ روڑکی، ہری دوار (اترانچل)

فون نمبر: 01332-276394 موبائل: 09897078604

Darul Uloom Qadria Sabria Barkaat-e-Raza

Peerane Kalyar, Po. Roorki, Haridawar, Uttranch

شعبۂ تاریخ وثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے استاذ

پروفیسر سید عزیز الدین احمد اور مولانا یٰسین اختر مصباحی

سے انقلاب ۱۸۵۷ء کے حوالے سے خصوصی گفتگو

۲۰۰۷ء انقلاب ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰ سالہ یادوں کا سال ہے، یہ یادیں ہمارے لیے کئی جہتوں سے مفید بھی ہیں اور فکر انگیز بھی۔ یہ سال خاص طور پر ہمیں عصر حاضر میں آزادی وغلامی کے مسئلے پر غور کرنے، اپنا محاسبہ کرنے اور گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں مسلمانوں نے کیا کھویا اور کیا پایا اس کا تجزیہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں ہم نے اس پہلو پر مواد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس خصوص میں عصر حاضر کے دو عظیم اسکالر پروفیسر سید عزیز الدین احمد استاذ شعبۂ تاریخ وثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور مولانا یٰسین اختر مصباحی دار القلم دہلی وسابق مدیر اعلیٰ ماہنامہ کنز الایمان دہلی کے خیالات بھی جاننے کی کوشش کی۔ اس موضوع کے لیے ان دونوں اسکالروں کے انتخاب کی وجہ یہ بنی کہ دونوں کا تاریخ سے خصوصی تعلق ہے اور دونوں ہی ۱۸۵۷ء پر علمی وتحقیقی کام کرنے میں مصروف ہیں۔ مولانا یٰسین اختر صاحب کی اس سال اب تک تین کتابیں "انگریز نوازی کی حقیقت"، "چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء" اور "علماء قائدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" شائع ہو چکی ہیں اور کئی دوسری زیر اشاعت یا زیر تالیف ہیں، دیگر زاویوں سے ان کی شخصیت ماہنامہ جام نور کے قارئین کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ پروفیسر سید عزیز الدین صاحب ۲۹ دسمبر ۱۹۵۲ء علی گڑھ میں پیدا ہوئے، علی گڑھ سے ہی تاریخ میں ایم اے کیا جبکہ پی ایچ ڈی کی تکمیل جامعہ ملیہ اسلامیہ سے کی اور یہیں استاذ مقرر ہوئے۔ ان کے ریسرچ کا موضوع "عہد اورنگ زیب عالمگیر" تھا۔ تاریخ میں اردو اور انگلش میں ۹۲ مضامین کے علاوہ پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس سال ان کی نئی کتاب 1857 Revisited آئی ہے جو کافی چرچے میں ہے۔ امید کہ قارئین جام نور کو ہمارے ان دونوں اسکالروں کی باتیں اچھی اور کارآمد لگیں گی ………… **خوشتر نورانی**

سوال (۱) - بہادر شاہ ظفر اور ان کے پیش روؤں کی آخر وہ کون سی کمزوری تھی جس نے انہیں اقتدار سے بے دخلی اور غلامی تک پہنچا دیا؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد - دیکھیے! اس کے لیے ہمیں تاریخ میں جانا ہوگا۔ مغل سلطنت کا زوال ۱۸ اٹھارویں صدی میں شروع ہوا، یہ صنعتی انقلاب کا دور تھا، اس زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغل سلاطین اس دور کو نہ سمجھ سکے، وہ صنعتی دور میں بھی جاگیردارانہ نظام کو زبردستی چلانے کی کوشش کرتے رہے۔ تو سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ ہم اپنی "سوچ" کو Developed نہیں کر سکے اور یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ یہ دور کیسا ہے اور اس کے چیلنجز کیا ہیں؟ اور کن طریقوں سے ہم یوروپی طاقتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اس کو آپ اس مثال سے سمجھیے کہ اگر کوئی میز پرانی ہو جائے اور وہ پرانی ہو کر ٹوٹ جائے، اور ہم اسے چولہے میں جلانے کی بجائے پھر نئے سرے سے ٹھوک ٹھاک کر کھڑی کر دیں تو میز پھر ٹوٹ جائے گی، کیوں کہ لکڑی کمزور ہو گئی ہے، اس میں کیلیں ٹھونکنے سے وہ اور کمزور ہوتی چلی جائے گی۔ یہی حال مغل دور میں جاگیردارانہ نظام کا تھا، وہ نظام کمزور ہو گیا تھا، اور مغل حکمران زبردستی اسے نافذ رکھنا چاہتے تھے جس کا نتیجہ سامنے آیا۔

مولانا یٰسین اختر مصباحی - ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ نے برطانوی تاجروں کو اس کی باضابطہ اجازت دی کہ وہ ہندوستان کے اندر تجارت کر سکتے ہیں، اس وقت جلال الدین محمد اکبر ہندوستان کا بادشاہ تھا، برطانوی تاجروں نے بہت محدود اور چھوٹے پیمانے پر معمولی سرمائے سے ہندوستان کے اندر اپنا کاروبار شروع کیا، اپنے کاروبار کو منظم اور مربوط کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی اور کچھ دنوں بعد سورت (گجرات) کے اندر کمپنی سے وابستہ افراد اپنی تجارتی کوٹھی بنانے میں کامیاب ہوئے، اور ابتدائی مرحلے میں وہیں سے اپنی تجارت اور اس کی سرگرمیاں بڑھانے اور پھیلانے میں شب و روز مصروف ہوئے۔

دوسرے مرحلے میں کلکتہ کے قریب ہگلی میں بھی کمپنی نے اپنی ایک تجارتی کوٹھی بنائی۔ تیسرے مرحلے میں اس نے جنوبی ہند کا رخ کیا اور مدراس کے آس پاس ایک نکتہ نما سینٹر بنایا۔ اسی طرح اڑیسہ میں بھی کمپنی نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے، لیکن کمپنی کا زیادہ زور بنگال میں

رہا اور رفتہ رفتہ کمپنی نے اتنا منافع کمایا کہ برطانیہ کو اس کا نہایت حوصلہ افزا مالی فائدہ پہنچا۔

تاریخی مطالعے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ مغل حکمراں برطانوی تاجروں کے اصل عزائم بھانپنے میں ناکام رہے، اکبر کے بعد نورالدین جہاں گیر اور اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں بھی انگریزوں کے تجارتی لبادے کے اندر چھپے ہوئے اغراض و مقاصد تک ان کی نظر نہ پہنچ سکی۔ صرف شائستہ خاں جو بنگال کا گورنر تھا اس نے اس طرف توجہ دی اور برطانوی تاجروں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی، کئی ایک سخت اقدامات کیے مگر ان کا تسلسل باقی نہ رہ سکا اور گھوم پھر کر انگریز وہی کرنے میں مصروف رہے جو ان کا اصل نشانہ تھا۔

جنوبی ہند میں سلطان ٹیپو کا باپ حیدر علی نے انگریزوں کی اصل خواہشات کو تاڑتے ہوئے شدید مزاحمت کی، لیکن نظام حیدر آباد اور مراٹھوں سے ساز باز کر کے انگریز اپنے آپ کو بچاتے رہے۔ حیدر علی کی پوری زندگی انگریزوں سے لڑتے ہوئے بیتی، مگر وہ جنوبی ہند سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہی حال ٹیپو سلطان کا بھی رہا، یہاں تک کہ ٹیپو نے فرانس اور ترکی تک اپنے قاصد بھیجے تاکہ ان کے تعاون سے انگریزوں کو جڑ بنیاد سے اکھیڑا جا سکے۔ مگر بد قسمتی سے ایسا کچھ نہ ہوا۔

ادھر شمالی ہند میں اپنے استحکام کے بعد انگریزوں نے سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک جال بچھا دیا۔ انہوں نے ایک طرف ہندوستان کی زراعت و تجارت و صنعت وغیرہ پر پنجے گاڑ دیے اور دوسری جانب اپنی حکمت عملی سے کرسی حکومت واقتدار کی طرف بڑھنا شروع کیا اور اس کے لیے مال و زر اور دھونس دھمکی کی ساری تدبیریں اپناتے ہوئے راجوں، مہاراجاؤں، نوابوں، زمین داروں، تاجروں، بنیوں کے درمیان ایسے وفادار غدار پیدا کیے جو ان کے اشارۂ ابرو پر رقص کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ جب بات حد سے زیادہ بڑھی تو شمالی ہند میں بھی محاذ آرائی کی نوبت آنے لگی۔ اور پہلی باقاعدہ جنگ پلاسی (بنگال) کے میدان میں علی وردی خاں کے نواسے نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان ۱۷۵۷ء میں ہوئی، اس کے بعد نواب شجاع الدولہ سے بکسر (بہار) کے میدان میں ۱۷۶۴ء میں، پھر حافظ رحمت خاں روہیلہ سے روہیل کھنڈ (موجودہ یوپی) کے اندر ۱۷۷۴ء میں ہوئی۔ اور آخری فیصلہ کن جنگ سرنگا پٹنم (جنوبی ہند) میں ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو سے ہوئی جس میں ان کی شہادت کے بعد ان کی لاش کے قریب کھڑا ہو کر ایک انگریز کمانڈر نے اعلان کیا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر کے انتقال کے بعد مغل حکومت کے زوال و انحطاط کا دور شروع ہو گیا تھا۔ اور جتنے بھی مغل بادشاہ اورنگ زیب کے بعد دہلی کے تخت و تاج کے وارث ہوئے وہ عزم و ہمت، بہادری و اولوالعزمی اور تدبیر جہاں بانی جیسی صفات سے عاری تھے اور ان کے اندر اتنی صلاحیت واستطاعت نہیں تھی کہ پورے ہندوستان پر اپنا قبضہ اور سکہ برقرار رکھ سکیں۔ دوسری جانب انگریز نہایت شاطر اور عزم و حوصلہ سے بھرپور تھے۔ اس لیے نہ مغل حکمران ان کی راہ میں حائل ہو سکے نہ ہی نواب اور راجا مہاراجا ان کا کچھ بگاڑ سکے۔ بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی کمان میں انگریزی فوج نے دلی پر دھاوا بول دیا اور شاہ عالم کو ایک ایسے معاہدے پر مجبور کر دیا جس کی رو سے شاہ عالم کی برائے نام بادشاہت باقی رہے، لیکن عملاً سارے ہندوستان پر انگریز حکومت کرتے رہیں۔ ٹھیک یہی حال اس سے پہلے لکھنؤ میں ہو چکا تھا کہ ۱۸۰۱ء میں نواب واجد علی شاہ کو انگریزوں نے ایک ایسے ہی معاہدے کا پابند بنا دیا تھا۔

بعد کے حالات میں ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ پر اور ۱۸۵۷ء میں دہلی پر اس طرح قبضہ کر لیا کہ بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت اور نواب واجد علی شاہ کی نوابی کا رہا سہا بھرم بھی ختم ہو گیا اور انگریز بلا شرکت غیرے پورے ہندوستان کے حکمراں بن گئے۔

سوال (۲):- انقلاب ۱۸۵۷ء کے محرکات میں سب سے اہم کیا تھا، سیاسی، مذہبی، معاشی، قومی، اخلاقی یا اور کچھ؟ نیز اس انقلاب میں سب سے نمایاں کون سا طبقہ تھا؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:- جہاں تک ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کا سوال ہے تو اس کے اسباب میں یہ سب چیزیں شامل تھیں، ان اسباب میں سیاسی بھی تھے، مذہبی بھی تھے اور ثقافتی بھی لیکن میرا خیال ہے کہ معاشی سبب سب سے اہم تھا، کیوں مغل دور حکومت میں مسلمان بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، لیکن جب سے انگریز آئے وہ انہیں اعلیٰ مناصب سے چھانٹتے گئے اور ان کو نوکریوں سے محروم کرتے گئے، مسلمانوں کے پاس اور کوئی پروفیشن

نہیں تھا، اسی طرح معاشیات کے جو ذرائع تھے وہ مسلمانوں کے لیے بند ہونا شروع ہو گئے، اس سے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے تئیں خطرات لاحق ہو گئے، سرسید نے جو اسباب بغاوت کے تعلق سے دو کتابیں لکھیں، سرکشی ضلع بجنور جو ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی اور اسباب بغاوت ہند جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی، ان میں انہی باتوں کی طرف خصوصی اشارہ ہے، ان میں مذہب بھی ہے، انگریزوں نے مساجد کو توڑا اور تمام مذہبی قدروں میں دخل دینا اور انہیں آہستہ آہستہ ختم کرنا شروع کیا۔ صرف اسلام ہی نہیں ہندو دھرم کے ساتھ بھی انہوں نے یہی سلوک کیا، تو یہ تمام باتیں ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں شامل تھیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ انقلاب میں نہ صرف بادشاہ، راجہ اور نواب بلکہ عوام بھی پورے طور پر سرگرم تھے۔ اس کو اس مثال سے سمجھیے کہ بہادر شاہ ظفر تو قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے، انگریزوں نے ۱۴ر ستمبر کو کشمیری گیٹ کو توڑا اور دہلی میں داخل ہوئے، لیکن کشمیری گیٹ سے لال قلعے تک پہنچنے میں انہیں پانچ دن کا وقت لگا۔ تو جب بادشاہ قلعہ چھوڑ کر چلے گئے تو بظاہر تو یہ ہوتا تھا کہ عوام Surrender کر جاتے، لیکن نہیں، وہ پانچ دن تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔

جہاں تک سوال کے اس حصے کی بات ہے کہ اس انقلاب میں پیش پیش کون سا طبقہ تھا؟ تو ہم اس میں تعین نہیں کر سکتے، بہادر شاہ ظفر بھی ہیں، تانتیا ٹوپے بھی ہیں، بہادر شاہ کے بیٹے بھی ہیں، نواب بھی ہیں، راجہ بھی ہیں۔ بلکہ اس انقلاب کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر جن لوگوں کے بارے میں سمجھتے تھے کہ وہ ہمارا ساتھ دیں گے انہوں نے ساتھ نہیں دیا اور جن پر ان کو اعتماد نہیں تھا انہوں نے ساتھ دیا، جیسے نواب جھجھر عبدالرحمن خان پر بادشاہ کو اعتماد تھا لیکن انہوں نے بہادر شاہ ظفر کا ساتھ نہیں دیا۔ دوسری طرف بلبھ گڑھ کے راجہ نہال سنگھ پر بادشاہ کو اعتماد نہیں تھا لیکن انہوں نے سلطان کا بھرپور ساتھ دیا اور انگریزوں کا خوب مقابلہ کیا۔ جس کی پاداش میں انگریزوں نے چاندنی چوک پر انہیں سولی پر چڑھا دیا۔ راجہ نہال سنگھ کا ایک دلچسپ خط بھی ہے بہادر شاہ ظفر کے نام، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ لوگ آپ کو میرے خلاف ورغلا رہے ہیں، حالاں کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب میں بلبھ گڑھ کا راجہ بنا تو یہاں کوئی مسجد نہیں تھی، میں نے ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی اور ایک عیدگاہ تعمیر کرائی۔ تو یہ عجیب اتفاق ہے کہ بہت سے مسلم نواب بہادر شاہ کا ساتھ نہیں دے رہے تھے اور ہندو راجہ جن پر بادشاہ کو مکمل اعتماد نہیں تھا وہ پورے طور سے ساتھ دے رہے تھے۔

مولانا یسین اختر مصباحی: انقلاب ۱۸۵۷ء کا کوئی ایک سبب نہیں، بلکہ اس کے متعدد اسباب و وجوہات تھے، ہندوستانی عوام اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہماری زمینی پیداوار کا اصل فائدہ انگریز اٹھا رہے ہیں۔ ہماری تجارت اور صنعت کو انہوں نے اس طرح جکڑ لیا ہے کہ اس کا اصل فائدہ برطانیہ کو پہنچ رہا ہے۔ ہمیں یا تو ان پڑھ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے یا ایسی تعلیم ہمارے بچوں کو دینے کے طریقے اور تدبیریں اپنائی جا رہی ہیں جسے حاصل کرنے کے بعد ظاہر میں وہ تو ہندوستانی رہیں لیکن ان کا دل و دماغ انگریزوں جیسا ہو جائے۔ ہمارے سماجی ڈھانچے توڑنے کی اور ہندو مسلم منافرت پھیلانے کی انگریز لگاتار کوشش کر رہے ہیں، اپنے پادریوں اور مشنری اسکولوں کے ذریعے ہمارے مذہب پر نہ صرف حملے کیے جا رہے ہیں بلکہ ہمیں عیسائی بنانے کی اعلانیہ کوشش ہو رہی ہے۔ ہمارے معزز شہریوں کو ذلیل و خوار کیا جا رہا ہے، ہمارے علما کی توہین کی جا رہی ہے، اور سات سمندر پار سے آ کر ہمارے اوپر حکومت کی جا رہی ہے۔ یہ وہ مجموعی اسباب ہیں جو انقلاب ۱۸۵۷ء کی بنیاد ہیں تاہم مذہب ایک ایسا عنصر ہے، جو سب پر فوقیت رکھتا ہے اور اہم ترین سبب یہی خوف ہے کہ ہمیں یا ہماری نسلوں کو جبراً عیسائی بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی در پردہ کوششوں کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی جنہوں نے ۱۸۴۶ء سے دلی، آگرہ، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ تک اپنی خفیہ مہم کا جال پھیلا رکھا تھا اور میرٹھ کے انقلابیوں میں بھی ان کے آدمی اپنا کام کر رہے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں بارک پور (کلکتہ) اور مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کے انقلابیوں نے گائے اور خنزیر کی ملی ہوئی چربی والے کارتوس کو دانت سے کاٹنے سے انکار مذہبی بنیاد پر ہی کیا تھا۔ اور ۱۰ر مئی کو میرٹھ سے چل کر جب ۱۱ر مئی کی صبح کو ۸۵ر انقلابیوں کا دستہ دہلی میں داخل ہوا تو وہ بھی دین، دین دھرم دھرم کے نعرے لگا رہا تھا۔

دہلی و روہیل کھنڈ اور اودھ انقلاب ۱۸۵۷ء کا اصل میدان کارزار تھے اور صحیح معنوں میں علمائے کرام کے فتاویٰ اور ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی مجاہدین اور انقلابیوں کا اصل سرمایہ تھا، مشورے اور

اقدامات میں علماے کرام کی رہنمائی ہر جگہ ضروری سمجھی جاتی تھی اور علماء کی پشت پناہی نے ہی انہیں حوصلہ بخشا تھا۔ اس لیے علماے کرام کا طبقہ ہی سب سے اہم تھا جس کی نمائندگی مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مفتی کفایت علی کافی مرادآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا وہاج الدین مرآبادی، مولانا رضا علی خاں بریلوی، مولانا امام بخش صہبائی وغیرہ کررہے تھے۔

سوال (۳) ۔ انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد کس نے دیا تھا اور اس کے انقلاب ۱۸۵۷ء پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد ۔ فتویٰ جہاد کا آغاز شاہ عبد العزیز سے شروع ہوا، پھر بعد میں دہلی کے بہت سارے علماء نے فتویٰ جہاد دیا، اور نہ صرف دہلی کے بلکہ علی گڑھ، مرادآباد، اور دوسرے مقامات کے علمانے بھی اپنے اپنے طور پر فتویٰ جہاد صادر کیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی اپنی مسجد میں جمعہ کے خطبات میں انگریزوں کے خلاف تقریریں کیں اور عوام کو ان سے لڑنے کی ترغیب دلائی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف جوش و جذبہ بھڑک اٹھا اور وہ آمادۂ جنگ ہو گئے اور یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے بعد میں انتقام بھی زیادہ مسلمانوں سے لیا، سب سے زیادہ مسلمانوں کو کچلا، پھانسی دی، برباد کیا، کالا پانی بھیجا، اتنی سخت کارروائی انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ نہیں کی۔ تو یہ جو کچھ ہوا سب کے سب فتویٰ جہاد کا ردعمل تھا۔

مولانا یٰسین اختر مصباحی ۔ دہلی کے اندر انگریزوں کے خلاف دیے جانے والے فتاواے جہاد کی متعین تعداد یقینی طور پر کسی مورخ نے نہیں لکھی ہے، البتہ بعض تاریخوں میں تین فتاوی کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان تینوں میں سے صرف ایک فتویٰ کی نقل مطبوعہ شکل میں موجود محفوظ ہے۔ کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں ہی دہلی کے ایک اخبار نے اس کی نقل شائع کر دی تھی۔ منشی ذکاء اللہ دہلوی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ علامہ فضل حق خیر آبادی نے ۱۸۵۷ء میں جامع مسجد دہلی کے اندر انگریزوں کے خلاف جہاد پر ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور اسی روز متعدد علماء کے دستخط کے ساتھ خود علامہ ہی کی تحریک پر ایک فتویٰ جہاد جاری ہوا۔ اسی طرح بریلی میں مفتی عنایت احمد کاکوروی، مرادآباد میں مولانا کفایت علی کافی، بدایوں میں مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ نے فتاویٰ جاری کیے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا ماحول تیار کیا۔

سوال (۴) ۔ مسلمانوں کا کون سا طبقہ انگریزوں کی تائید و حمایت میں تھا؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:۔ اس میں بھی ہم کوئی تعین نہیں کر سکتے، مسلمانوں کے ہر طبقے میں مخالف بھی نظر آتے ہیں اور موافق بھی۔ علماء میں بھی علامت سے انگریزوں کے ساتھ تھے، زمین داروں میں بھی بہت ساتھ تھے، شعراء میں بھی بہت سے ساتھ تھے، غدار شعراء بھی ہیں جنہوں نے انگریزوں کی حمایت کی اور وہ شعراء بھی ہیں جن کے کلام کی وجہ سے انگریزوں نے انہیں شہید کرا دیا، تو آپ تعین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ اس طبقے نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور اس نے ان کی مخالفت کی، دہلی کے مولوی باقر جو دہلی کے اردو اخبار کے ایڈیٹر تھے انہوں نے انگریزوں کے خلاف اپنے اداریے لکھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے، سادات میں بھی کچھ ایسے تھے جو انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے اور کچھ سادات ایسے تھے جو ان کے خلاف تھے۔ شعراء میں غالب کے کلام میں بھی انگریزوں سے نفرت ہے، لیکن غالب کی دو تصویریں ہمارے سامنے ہے ایک تصویر انگریزوں کی موافقت میں ہے جب کہ دوسری مخالفت میں ہے۔ غالب کے مقابلے دوسرے شعراء کو دیکھیں تو انہوں نے انگریزوں کے خلاف زیادہ واضح باتیں کہیں مثلاً مولوی محمد حسین آزاد کو لیجیے جو مولوی باقر کے بیٹے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف نظمیں لکھیں جو دہلی اردو اخبار میں چھپیں۔ ان کے علاوہ مرادآباد اور امروہہ کے شعراء جن کا قد نسبتاً چھوٹا ہے، جس کی وجہ سے کوئی ان کا نام نہیں لیتا، انہوں نے انگریزوں کے خلاف خوب لکھا اور ان میں سے بہتوں کو دار و رسن کے پھندے چومنے پڑے۔

مولانا یٰسین اختر مصباحی ۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو جنوبی ہند میں انقلاب تو کیا کوئی قابل ذکر جنبش بھی نہیں ہوئی اور نظام حیدرآباد تو انگریز نواز تھے ہی، ادھر دہلی سے متصل صوبۂ پنجاب جو ہمیشہ ہندوستان کا بازوے شمشیر زن مانا جاتا رہا تھا، یہ بازو نہ جانے کیوں مجموعی طور پر مفلوج رہا، ادھر روہیل کھنڈ میں نواب رام پور نظام حیدرآباد کی طرح انگریزوں کے وفادار ثابت ہوئے۔ اور مرادآباد وغیرہ میں انقلابیوں کی بیخ کنی کرنے میں کوئی کسر

اٹھا نہ رکھی، ہندوؤں کے درمیان اگرچہ منگل پانڈے، رام کنور سنگھ، رانی لکشمی بائی، نانا پیشوا، تانتیہ ٹوپے، راجا ناہر سنگھ جیسے جواں مرد اور جیالے نظر آتے ہیں، مگر مجموعی طور پر ہندوؤں کے اندر وہ جوش و خروش نہیں تھا جو مسلمانوں کے اندر جگہ جگہ پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں ہی کو زیادہ نشانہ بنایا اور لاکھوں مسلم عوام کے ساتھ ہزاروں علما کو پھانسی دی یا کالا پانی بھیجا، یا انہیں تباہ و برباد کیا اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اندر جوش و خروش اور جذبۂ جہاد علما کے فتاویٰ کی بنیاد پر ہی تھا اور ان کا جذبہ یہ بھی تھا کہ انگریزوں نے مکر و فریب اور ظلم و جارحیت کے ذریعے یہ ملک ہم سے چھینا ہے اس لیے ہمیں بڑھ کر ان انگریزوں سے بزور قوت و طاقت دوبارہ اپنی اس میراث کا وارث بننا ہے اور اس ملک پر ہمیں اپنی حکومت قائم کرنی ہے۔

سوال (۵) :- انقلاب ۱۸۵۷ء کے موقع پر ہندو مسلم اتحاد کی کیا صورت تھی؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد :- اس وقت ہندو مسلم اتحاد تھا، لیکن انگریزوں نے اسے توڑنے کی کوشش کی۔ جیسے ایک دستاویز مجھے ملا کہ انگریزوں نے اس زمانے میں پچاس ہزار روپے بریلی کے کلکٹر کو بھیجے تا کہ اسے ہندوؤں میں تقسیم کیا جائے اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جائے۔ لیکن انگریز اپنے اس منصوبے میں ناکام ہو گئے۔ بریلی کے کلکٹر نے باضابطہ یہ خط لکھا کہ ہم یہ پیسے واپس کر رہے ہیں کیوں کہ ہم اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تو اس طرح کے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی، بعض میں انہیں کامیابی بھی ملی۔ لیکن فی الجملہ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی صورت بہتر تھی۔

مولانا یٰسین اختر مصباحی :- انگریز مجموعی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں کا مشترکہ دشمن تھا، کیوں کہ ہندو اور مسلمان ہی اس ملک کی غالب اکثریت تھی، اس لیے کئی جگہوں پر ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کی۔ لیکن یہ سب کے سب بہادر شاہ ظفر کو ہی اپنا بادشاہ سمجھتے تھے یہ سب اسی لیے رانی لکشمی بائی، نانا پیشوا، تانتیہ ٹوپے وغیرہ نے سبز پرچم لہرایا تھا، بہادر شاہ ظفر کو دلی کے تخت و تاج کا اصل مالک سمجھتے تھے۔

سوال (۶) :- آزادی ۱۹۴۷ء پر انقلاب ۱۸۵۷ء کے کیا اثرات رہے؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد :- آزادی کی لڑائی کا آغاز تو ۱۸۵۷ء سے ہی ہوا، اسی لیے اسے پہلی جنگ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں، انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں کامیابی کے بعد تین یونیورسٹیز قائم کیں، مدارس، بمبئی اور کلکتہ اور یہ اتفاق ہے کہ جو ہندوستانی ان یونیورسٹیز میں پڑھے فراغت کے بعد انہی لوگوں نے آزادی کی باضابطہ جد و جہد کا آغاز کیا اور نتیجہ کے طور پر ۱۹۴۷ء میں اپنا ملک انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہو گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی ۱۸۵۷ء کی دین ہے، ظاہر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے بعد ہی سر سید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم دلایا جائے اور انہیں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھایا جائے تا کہ جدید صنعتی انقلاب کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی ہے مسلمان اس کا مقابلہ کر سکیں۔ مدرسے تفسیر و حدیث کی تعلیم تو دے رہے تھے لیکن جو صنعتی انقلاب ظہور پذیر ہوا تھا مسلمان اس کا مقابلہ کیسے کرتے، اس کے لیے جدید تعلیم کا حصول ضروری تھا۔ اس طرح ہم علی گڑھ تحریک کو بھی ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا ہی نتیجہ سمجھتے تھے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے کہ ۱۹۴۷ء کی آزادی انقلاب ۱۸۵۷ کا ہی نتیجہ ہے۔

مولانا یٰسین اختر مصباحی :- کئی مورخین نے صاف صاف یہ تحریر کیا ہے کہ ۱۹۴۷ء دراصل ۱۸۵۷ء کا تکملہ ہے، ۱۹۴۷ء سے پہلے کے زعماء و قائدین کو تحریک دراصل ۱۸۵۷ء ہی سے ملی اور ہمارا ہندوستان مدتوں بعد آزادی سے ہمکنار ہوا اور یہ واضح ہے کہ حال کی تاریخ کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے اور بہت سی چیزوں کے اثرات و نتائج کسی نہ کسی شکل میں بعد میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کا بھی ہے۔

سوال (۷) :- ملکی سطح پر انقلاب ۱۸۵۷ء کی جد و جہد میں مسلمانوں خصوصاً علماء کو نظر انداز کرنے کے کیا اسباب ہیں؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد :- دیکھیے! دوسروں پر الزام دینے سے پہلے ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ ہم نے کیا کام کیا؟ ہندوستان اور پاکستان میں صرف ۱۸۵۷ء کے ۷۰ ہزار Documents موجود ہیں اور یہ سب کے سب اردو اور فارسی میں ہیں۔ اب یہ بتائیے ان دستاویزات کی تحقیق اور چھان بین کون

کرے گا؟ پروفیسر گیان شرما یا پروفیسر ترادری بھٹا چاریہ ان دستاویزات پر کیسے کام کریں گے؟ یہ کس کی ذمہ داری ہے؟ یہ ذمہ داری ہے شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی کی، شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کی، شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی، شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی، شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی اور عربی مدارس کے ان اساتذہ کی جو اردو اور فارسی جانتے ہیں، سوال ہے کہ ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے باوجود آخر کیوں ان لوگوں نے ان دستاویزات پر کام نہیں کیا؟ کب تک ہم دوسروں کو یہ الزام لگاتے رہیں گے کہ ہمارا نام نہیں آتا- آپ کا نام جب آئے گا جب آپ کام کریں گے- آپ جب میرا انٹرویو لینے آئے ہیں جب ہی تو میں آپ کو انٹرویو دے رہا ہوں- اگر آپ میرے پاس آتے ہی نہیں تو میں کیسے آپ کو انٹرویو دیتا- تو سب سے پہلے ہم خود ذمہ دار ہیں- آزاد ہندوستان میں مسلم ثقافت کے تحفظ کی ذمہ داری دو اداروں پر ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ- تو آپ پہلے ان پر سوال اٹھایئے بہ نسبت دوسرے دانشوروں کے جو دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ہیں- ہم تو خود کچھ کام کرتے نہیں اور بیٹھے بیٹھے دوسروں پر الزام دھرتے اور شکوے کرتے ہیں- ہم سرسید پر بھی الزام دھرتے رہتے ہیں لیکن آخر ہمارے اندر سرسید جیسا کام کرنے کا جذبہ کیوں نہیں پیدا ہوتا؟ تو صرف دوسروں کو الزام دینے سے کام نہیں چل سکتا، ہمیں خود کام کرنا ہوگا- مرادآباد میں جو لوگ مارے گئے، جو شہید کیے گئے جو لوٹے گئے کیا مرادآباد والوں کو آج ان کے نام معلوم ہیں؟ علی گڑھ کے مسلمانوں کو اپنے شہیدوں کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ آپ ہمیں بتایئے کہ جتنے بڑے شہر ہیں، دہلی، علی گڑھ، مرادآباد وغیرہ ان شہروں کے مسلم تنظیموں نے ۱۸۵۷ء پر کوئی پروگرام کیا؟ تو کون ہائی لائٹ کرے گا آپ کو، دینک جاگرن، ہندوستان اور دوسرے ہندی یا انگریزی اخبارات جب ہی تو خبر شائع کریں گے جب آپ مدرسے میں اپنے ادارے میں ۱۸۵۷ء پر پروگرام کریں گے، بتایئے مرادآباد، بریلی، سہارنپور، امروہہ، علی گڑھ کے کسی مدرسے نے اس پر کوئی پروگرام کیا اور نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا؟ ۱۰؍ مئی سے اس کی ۱۵۰؍ سالہ سال گرہ شروع ہوگئی اور آج ۲۶؍ جون ہو گیا کسی ادارے نے کوئی پروگرام نہیں کیا، میں نے کوئی خبر نہیں پڑھی- تو صرف دہلی یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کیوں ذمہ دار ہیں؟ پہلے تو ہمارے ادارے ذمہ دار ہیں، ہم ذمہ دار ہیں، ہمارے علماء ذمہ دار ہیں، دانشور ذمہ دار ہیں، ان لوگوں نے اس پر کیا کام کیا؟ جو بڑے بڑے عہدے اور مناصب لیے ہوئے ہیں وہ اس طرف کیوں نہیں توجہ کرتے؟ جامع مسجد کو دو سال تک انگریزوں نے اصطبل بنائے رکھا، تو کیا دہلی کی جامع مسجد میں کوئی پروگرام ہوا اس حوالے سے کہ ہمیں اپنی تاریخ معلوم ہوتی؟ صرف دوسروں کو ملزم ٹھہرانے سے کام نہیں چلے گا- پہلے ہمیں کام کرنا ہوگا، پہلے ہمیں کتابیں لکھنی ہوں گی، جب ہماری تحریریں دوسرے پڑھیں گے تب ان کی تحریروں میں وہ باتیں آئیں گی-

مولانا یسین اختر مصباحی -انقلاب ۱۸۵۷ء کا ذکر اور چرچا اس کی حیثیت اور عظمت کے مطابق نہ کیا جانا ایک نہایت افسوس ناک رویہ ہے اور اس رویے کو جلد از جلد تبدیل کیا جانا چاہیے- ہندو تو اس کے ذکر سے عموماً اس لیے کتراتے ہیں کہ انقلاب کی کمان اور باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی- لیکن بعض مسلمان دانش ور اور مورخین بھی اسے اس لیے نظر انداز کرتے ہیں کہ ان مسلمانوں کی کمان علماء کے ہاتھوں میں تھی اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ طبقۂ علما کو یہ حضرات کس نگاہ سے دیکھتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ حتی الامکان ان افراد کی تاریخ اور اس کے قائدین کے حالات توڑ مروڑ کر پیش کیے جاتے ہیں اور اصل حیثیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے-

سوال (۸):-انقلاب ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰؍ ویں برسی پر ہندوستانیوں کو اس سے کون سا سبق ملتا ہے؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:-۱۸۵۷ء سے ہندوستانیوں کو بہت بڑا سبق ملتا ہے، وہ یہ کہ آج کے حالات ۱۸۵۷ء سے بہت مختلف نہیں ہیں، اگر آج ہم میں وہی غفلت رہی جو ۱۸۵۷ء کے موقع پر تھی تو غیر ملکی طاقتیں پھر سے ہمیں اپنا غلام بنالیں گی، ویسے بھی ہم آج یورپ کی ٹکنالوجی کی دنیا میں غلام ہیں، انہی کی ایجاد کردہ چیزیں ہم استعمال کرتے ہیں وہ بھی اس طرح کہ جو چیزیں وہ ۲۰؍ سال پہلے استعمال کر چکے ہوتے ہیں انہیں ہم آج استعمال کرتے ہیں- خلاصہ یہ ہے کہ آج بھی ہم غیر ملکی طاقتوں کی غلامی قبول کیے ہوئے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں- ہماری غفلت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ یورپ میں زمانے سے جمہوریت قائم ہے اور اسی

جمہوریت کی وجہ سے اہل یورپ بہت آگے بڑھ چکے ہیں جب کہ ہمارے یہاں آج بھی بہت سے مسلم ممالک میں موروثی بادشاہت قائم ہے، آپ خود سوچیے کہ موروثی بادشاہت سے کیا ہم خاک ترقی کریں گے؟ تو مسلم دنیا کو خاص طور پر ۱۸۵۷ء سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے یہاں جمہوریت نہیں قائم کی اور موروثی بادشاہت سے چمٹے رہے تو ان کا حشر بھی مغل حکومت سے مختلف نہیں ہوگا- آپ ایران کی مثال لیں جہاں ۱۹۷۹ء میں جمہوریت قائم ہوئی اور آج وہ کسی لائق ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ یوروپی ممالک کے نشانے پر بھی ہے- حاصل یہ کہ تمام مسلم ممالک میں جمہوریت لانے کی کوشش ہونی چاہیے، ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس سلسلے میں کسی عالم کی کوئی تحریر نہیں پڑھتے، پتہ نہیں کس مصلحت نے ان کی زبانیں بند کر رکھی ہیں جب کہ جمہوریت کا پہلا داعی اسلام ہے- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۲ء میں سب سے پہلے اسلامی جمہوریت قائم کی تھی- بعد میں ہم نے ملوکیت کو قبول کرلیا، یہی ہمارے زوال کا سبب بنی ہے اور رہے گی-

مولانا یسین اختر مصباحی -اس تاریخی انقلاب سے یہ سبق ملتا ہے کہ قوم کو غلام نہیں بلکہ آزاد رہنا چاہیے- اس کے ساتھ ہی اپنے آپ کو مضبوط اور منظم رکھنا چاہیے، اسی طرح اپنی صفوں میں پائے جانے والے غداروں سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے اور کسی بھی خارجی قوت کے مقابلے میں ہندو مسلمان دونوں کو سیاسی سطح پر متحدہ اقدام کرنا چاہیے- آج کے حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف برطانیہ نہیں بلکہ پورے یورپ اور ان سب کے آقا امریکہ نے سیاسی اور تجارتی راستوں سے ہندوستان کے اندر گھس پیٹھ اور اسے کنٹرول کرنے کی جو نئی مہم چھیڑ رکھی ہے اور بظاہر ایک بہت چھوٹے مگر اندر سے نہایت خطرناک اور مضبوط عنصر جسے یہودی لابی کہا جاتا ہے، ان سب سے ہمیں قدم قدم پر ہوشیار رہنا چاہیے-

☆☆☆

بقیہ: مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی

(۱) پروفیسر ایوب قادری: جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد مولانا فیض احمد بدایونی، ص ۹، ایجوکیشنل پریس کراچی، مطبوعہ ۱۹۵۷ء-

(۲) ملفوظات مفتی بحوالہ مرجع سابق-

(۳) ضیاء القادری اکمل التاریخ جلد اول، ص ۹۰ ہو کٹوریہ پریس، ۱۳۳۰ھ-

(۴) پروفیسر ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد ص ۱۴، ایجوکیشنل پریس کراچی، ۱۹۵۷ء-

(۵) مرجع سابق- (۶) اکمل التاریخ، ص ۹۰-

(۷) عبدالحکیم شرف قادری مقدمہ سیف الجبار، مطبوعہ مکتبہ رضویہ لاہور ۱۹۷۲ء-

(۸) مرجع سابق-

(۹) مولانا عبدالقادر بدایونی تحفۂ فیض ص ۸، فخر المطابع میرٹھ-

(۱۰) رسالہ سابق الذکر ص ۳۹-

(۱۱) تحفۂ فیض، ص ۸-

(۱۲) اکمل التاریخ ص ۹۱-

(۱۳) تحفۂ فیض، ص ۸-

(۱۴) رسالہ سابق الذکر ص ۳۷-

(۱۵) اکمل التاریخ ص ۶۲-

(۱۶) رسالہ سابق الذکر، ص ۲۰۰ تا ۲۱۲

بقیہ: انقلاب ۱۸۵۷ء اسباب اور نتائج

سماجی اصلاحات کے تئیں رویہ:- انگریزوں نے اب سماجی اصلاح کا کام کرنے والوں کی مدد کرنے کی اپنی پالیسی کو ترک کردیا۔ ان کا خیال تھا کہ ستی جیسے رواج کو ختم کرنے اور بیوہ کو دوبارہ شادی کی اجازت دلوانے کے سلسلے میں ان کی سماجی اصلاحات بغاوت کا ایک اہم سبب بن گئیں۔ اس لئے وہ رفتہ رفتہ قدامت پرستوں کی طرف جھکتے گئے۔ اور انھوں نے مصلحین کی حمایت اور مدد کرنا بند کردیا۔ اس طرح سے انھوں نے اپنا سیاسی الوسید ھا کرنے کی غرض سے ذات پات کے بھید بھاؤ اور فرقہ پرستی کو بڑھاوا اور سماجی رجعت پسندی کو ہوا دی۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ بغاوت کے بعد ہندوستان میں انگریزی حکومت نے انتظامی اداروں میں ایسے اقدامات کئے جو ان کے خیال میں حکومت کو استحکام بخشنے میں معاون ہوں۔ لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کردیا کہ ان کی یہ تدابیر انتقامی جذبوں کے تحت تھیں اس لئے رائیگاں گئیں۔ اور اس بغاوت کے اثرات ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے لئے تباہ کن ثابت ہوئے۔ اور ہندوستانیوں کے اندر غیر ملکی اقتدار کے خلاف نفرت کے جذبات رفتہ رفتہ پروان چڑھتے رہے جو 1947 میں مکمل آزادی کی شکل میں سامنے آئے-

ڈاکٹر خواجہ اکرام☆

انقلاب ۱۸۵۷ء میں اردو زبان کا کردار

ادب کے حوالے سے بار ہا یہ سوالات اٹھتے رہے ہیں کہ ادب اپنی نوعیت کے اعتبار سے کیا ہے؟ کیا ادب محض ذوق جمال کی تسلین کا ذریعہ ہے یا ادب معاشرتی اقدار اور ہم عصر مسائل کا عکاس ہے۔ یہ سوالات کلاسیکی دور سے ہی کئی زاویوں سے ادب کی اہمیت وافادیت پر سوالیہ نشان قائم کرتے رہے ہیں۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے تناظر میں جو بحثیں ہوئی ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ضرور ہے کہ دونوں طرح کی ادبیات کا اپنا اپنا مقام ہے۔ دونوں نظریات کے تحت تخلیق کیے جانے والے ادب میں یادگار زمانہ اور شاہکار تصانیف بھی موجود ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا نے اُسی ادب کو زیادہ سراہا جس ادب نے ہم عصر مسائل، تقاضے،

رجحانات اور رویوں کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہے۔ ادب کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ ہر ادب اپنا ایک علاقہ اور اپنی مخصوص تہذیبی شناخت رکھتا ہے۔ گویا ہر خطے کا ادب اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ زندہ وتابندہ رہتا ہے۔ ادب کو تہذیب سے اور تہذیب کو ادب سے الگ کر کے دیکھا نہیں جاسکتا۔ ادب کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ادب کی تخلیق انسان کرتا ہے اور انسان جس معاشرے، تہذیب اور ثقافت کا پروردہ ہوتا ہے، اسی معاشرے اور تہذیب کی عکاسی ادب میں ہوتی ہے۔ ادب چونکہ خلا میں تخلیق نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا جس طرح کا بھی ادب تخلیق کیا جائے گا اس میں کسی نہ کسی طور عہد کے حالات اور تہذیبی تناظر ضرور شامل رہیں گے۔ خواہ لکھنے والا محض ذوق جمال کی تسکین کے لیے یا تفریح طبع کے لیے ادب کی تخلیق کر رہا ہو۔ اس اعتبار سے دنیا کے کسی بھی ادب سے اس مخصوص خطے کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ معلوم کی جاسکتی ہے۔ لیکن جس ادب کی تخلیق سیاسی وسماجی حالات کو سامنے رکھ کر کی گئی ہو اس ادب کو تاریخ کے بنیادی ماخذ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ہندستان کی پہلی جنگ آزادی کے حوالے سے جب ہم اردو ادب کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تو دراصل ہم اس ادب سے یہی تقاضا کرتے ہیں کہ اس ادب میں اس عظیم سانحے اور واقعے کے توسط سے بھی کچھ موجود ہونا چاہیے۔ گویا ہم بالواسطہ ادب سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ادب کو اپنے زمانے اور عہد کا نہ صرف عکاس ہونا چاہیے بلکہ اسے بے رحم نقاد بھی ہونا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ ہمارا ادب دراصل ہماری اپنی ذہنی اور فکری زندگی کا عکاس ہوتا ہے، ہمارا معاشرہ جس قدر ترقی یافتہ اور دور اندیش اور پیچیدہ ہوگا، ادب بھی اتنا ہی پیچیدہ اور ترقی یافتہ ہوگا۔ لیکن ادب کو اس مقام تک پہنچنے میں بھی کئی اہم مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں اس موضوع پر گفتگو کا مقام نہیں۔ لیکن اس پس منظر میں جب ہم اردو ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان وادب نے وطن کے سپاہیوں کے دوش بدوش اس جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔

اردو زبان اس عہد میں رابطے کی زبان تھی، اس زبان کو تخلیقی اعتبار سے دیگر علاقائی زبانوں میں امتیاز حاصل تھا، یہی وہ زبان تھی جس کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی البتہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبانوں کو بھی حکومتی سطح پر اعزاز حاصل تھا۔ اس لیے اس عہد کے جتنے دستاویز ملتے ہیں وہ اردو، فارسی اور عربی زبان میں ہیں۔ ان زبانوں کے ذخیرے میں تاریخ کے وہ تمام نشیب وفراز کی کہانی موجود ہے۔ لیکن المیہ ہے کہ اس عہد کی تاریخ لکھنے والوں نے کبھی ان بنیادی ماخذ کی طرف جھانکنے کی بھی غلطی نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کو نیست ونابود کرنے والوں نے خود ہی تاریخ لکھی اور جس طرح چاہا اسے مسخ کیا۔ اس پر طرہ یہ کہ ہمارے ملک کے تاریخ نویسوں نے بھی جب قلم اٹھایا تو انھیں مستشرقین کا حوالہ دیا کیونکہ آج بھی ہم اپنی باتوں میں سند کے لیے انھیں آقاؤں کا نام لیتے ہیں، یہ دراصل محکومیت کی نفسیات ہے جس سے آج تک ہمارا پیچھا نہیں چھوٹا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ڈیڑھ سو برس ہونے آئے ابھی تک ہم نے اپنی تاریخ کو اپنے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اگر ان سچائیوں کو ادب کے حوالے سے بھی دیکھیں تو بہت سے حقائق سے پردہ ابھی بھی اٹھ سکتا ہے۔

اردو ادب کی تمام اصناف میں اس اہم تاریخ کے حوالے موجود ہیں، کہیں بہت ہی واشگاف انداز میں ہیں تو کہیں محض اشاروں اور کنایوں

☆WF 06,Barhamaputra Hostel, Poorvanchal J.N U.New Delhi-110067

میں ہیں، لیکن یہ تحریکاتی تحریریں بھی بخوبی عہد کے حالات کے غماز ہیں۔

خطوط، مضامین، کہانیاں، منظومات، کے علاوہ صحافت کا بڑا رول رہا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس واقعے نے ایک طرف ملک کا سارا انتظام بدل ڈالا تو دوسری جانب خود ہندستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ صدیوں سے بنی بنائی قدروں کو لمحوں میں مسمار کر دیا۔ مشرقی تہذیب پر مغربی یلغار نے دانشوروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ عیسائیت کو حکومت کی سرپرستی میں فروغ دینے کی منضبط کوششوں نے ایک نیا محاذ کھول دیا، وہ جو دوسروں کی کفالت کرتے تھے اب خود ہی دو وقت کی روٹی کے لیے محتاج ہو گئے، اس معاشی پست حالی نے ہندستانیوں کی کمر توڑ دی۔ چونکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے انھیں یہ خدشہ تھا کہ اگر یہ دوبارہ متحد ہو گئے تو ہم سے نہ صرف حکومت چھین لی جائے گی بلکہ ہمارا نام و نشان بھی مٹا دیا جائے گا۔ اس لیے ان کا One Point پروگرام تھا کہ انھیں نفسیاتی اعتبار سے اتنا کمزور کر دو کہ یہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں۔ اسی منصوبے کے تحت انھوں نے مذہبی منافرت کا بھی سہارا لیا اور ہر محاذ پر خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی یا علمی انھیں محرومیوں کا سامنا کرنے پر مجبور کیا۔ وہ محب وطن جو وطن کی خاطر اپنی جان و مال کی بھی پروا نہیں کر رہے تھے، ایسے جاں نثاروں کی ان کی پاس ایک طویل فہرست تھی، حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد انھیں ایسی عبرتناک سزائیں دیں کہ دیکھنے والا ان کی مخالفت کی سوچ بھی نہ سکے۔ اس اندوہناک صورت حال میں سب سے بڑی ضرورت تھی کہ عوام کو محرومی کے احساس سے نکالا جائے اور نفسیاتی اعتبار سے ٹوٹے بکھرے لوگوں کو ہمت و حوصلہ فراہم کی جائے۔ اس وقت کسی بھی اقدام سے عوام الناس کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہونا تھا، جتنا کہ اس اقدام سے ہوا جو اردو کے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور علمائے کرام نے کیا۔ ان تفصیلات سے قبل جملۂ معترضہ کے طور پر یہ ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ آج ادب کے طالب علم اپنے اسلاف کے ان کارناموں کو پڑھ کر فخر محسوس کرتے ہیں لیکن اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ اس حوالے سے آپ کتنے نام گنا سکیں گے تو وہ شاید پانچ دس نام سے بعد آگے نہ بڑھ سکیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ ان ناموں میں ایک طبقے کو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ ہے علمائے کرام کی تحریریں۔ ۱۸۵۷ء کے حوالے سے اردو ادب کا ذخیرہ بہت ہی وسیع ہے مگر المیہ ہے کہ ہم تعصبات کے شکار ہیں۔ ہم نے علما، کی تحریروں کو یکسر نظر انداز کیا ہے اور اسے ادب کے دائرے سے ہی خارج کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود اپنا سرمایہ ہم اپنے ہاتھوں سے ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی بھی جو کچھ موجود ہے اس میں بھی علماء اور مذہبی شخصیات کی تحریریں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ کے بعد ادیبوں کی جانب سے طرح طرح کے رد عمل سامنے آئے۔ ۱۸۶۰ء ہی میں "فغان دہلی" کے نام سے شاعری کا مجموعہ سامنے آیا جس میں بیشتر ایسے شاعروں کا کلام ہے جو خود اس جنگ میں عملی طور پر شریک رہے۔ "الہ آباد میں شورش کے موقعے پر جو اشتہار بنام شاہ اودھ اور دیگر مقامات قرب و جوار میں مشتہر کیے گئے تھے ان میں سے دو پنڈت کنہیا لال نے محاربۂ عظیم (صفحہ ۳۰۰) میں نقل کیا ہے۔ یہ دونوں اشتہار اردو میں ہیں ایک نثر میں ہے اور ایک نظم میں"۔ یہ اشتہار اس طرح ہے۔

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد   اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن و احادیث میں خوبیِ جہاد   ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کر لو یاد
فرض ہے تم پہ مسلمانو جہاد کفار   اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار
جو نہ خود جاوے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال   اس پہ ڈالے گا خدا پیشتر از مرگ وبال
جو راہِ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں   بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں
حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں   مثل دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں
اے مسلمانو سنی تم نے جو خوبیِ جہاد   چلو اب رن کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹخاؤ گے   اپنی سستی کا بڑا افسوس نہ پھل پاؤ گے
بارہ سو برس کے بعد آئی یہ دولت آگے   حیف اس دولتِ بیدار سے مومن بھاگے

تھے مسلمان پریشان بغیر از اسباب　　شکر سب تو نے دیا اے مرے رب الارباب
یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ درکار　　سب دیا تو نے ہمیں اور کیا پھر سردار
بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو　　وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ کر مارو

(بحوالہ ہندستان کی جنگ آزادی اور اردو شاعری: گوپی چند نارنگ)

مومن خان مومن دہلوی بھی اس یورش کے عینی شاہدین میں سے ہیں۔ انگریزوں کی بڑھتی طاقت، کے پیش نظر انھیں دہلی اور لال قلعہ کی تباہی کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، اسی لیے انھوں نے بھی وہی باتیں کہیں جو اس وقت تمام علماء، مفتیان اور دانشوروں نے کہی تھی، ان کے مطابق انگریزوں سے لڑنا ایک طرح کا جہاد تھا۔ اور لوگ جہاد سمجھ کر ہی اس میں شریک ہو رہے تھے۔ آج کا معاملہ یہ ہے کہ اس لفظ کو اس قدر بے حرمت کر دیا گیا ہے کہ جہاد کے نام سے لوگ مسلمانوں کو گویا دشنام دیتے ہیں (یہ بحث طلب موضوع ہے جس پر گفتگو ہونی چاہیے)۔ لیکن آپ یہ ملاحظہ فرمائیں کہ اس وقت ملک کی حفاظت کے لیے اسی جذبۂ جہاد نے لوگوں کو مجتمع کیا جنھوں نے اپنے ملک کی حفاظت میں خون کا ایک ایک قطرہ بھی نچھاور کر دیا۔ انگریزوں کے خلاف اسی جہاد کی تلقین کرتے ہوئے مومن نے مثنوی جہادیہ لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو　　حیات ابد ہے جو اس دم مرے
سعادت ہے جو جانفشانی کرے　　یہاں اور وہاں کا مرانی کرے
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگر چہ ہوں میں تیرہ کار　　پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں　　اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

مومن نے صرف یہ مثنوی ہی نہیں لکھی بلکہ کئی جگہوں پر اس کا ذکر کیا، ان کے یہ اشعار بھی دیکھیں

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاس ایماں　　ہے معرکہ جہاد چل دیجئے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز　　وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

صہبائی نے دلی کے لٹ جانے کے بعد کے دور کو جس انداز میں اپنے اشعار میں پیش کیا ہے وہ انتہائی کرب انگیز ہے انھوں نے ذیل کے اشعار میں ان شہزادیوں اور رئیسوں کی بدحالی کا ذکر کیا ہے کہ جنھوں نے کبھی کوئی تکلیف نہیں دیکھی آج ان کا کیا حال ہے ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں

زیور الماس کا تھا جن سے نہ پہنا جاتا　　بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گاج کا جن سے دو پٹہ نہ سنبھالا جاتا　　لاکھ حکمت سے اوڑھتے تو نہ اوڑھا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی　　مہندی ہاتھوں میں لگاتے تو کیا گھبراتی
شام سے صبح تلک نیند نہ ان کو آتی　　ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی

ان کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اٹھایا تو سرہانے رکھا

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے　　سر ہے اور جوش جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے　　مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

(فغانِ دہلی)

اور غالب خستہ حال نے غدر کے بعد کے منظر کو اس طرح بیان کیا ہے۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے　　زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک　　آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا　　وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ　　سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم　　ماجرا دیدہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب　　کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

داغ دہلوی جو حسن و شباب کے شاعر سمجھے جاتے ہیں انھوں نے بھی اس تاراجی کی داستان کو دردانگیز لہجے میں لکھا۔ ان کے شہر آشوب کے چند بند ملاحظہ ہوں جن میں انھوں نے پہلے دہلی کی شان و شوکت کو بیان کیا ہے پھر میرٹھ میں وطن پرستوں کی بغاوت کو بیان کرتے ہوئے ان کے دلی آنے کا ذکر کیا ہے اور پھر اس کے بعد دلی کی تباہی کا منظر پیش کیا ہے۔

یہ شہر وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا　　یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدر دان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندستان کا دل تھا　　یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
رہی نہ آدمی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

فلک نے قہر و غضب تاک کر ڈالا　　تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا　　غرض کے لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے　　غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے　　قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

غضب ہے بخت بد ایسے ہمارے ہو جائیں　　کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں　　جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہو جائیں
پئیں جو آب بقا بھی تو زہر ہو جائیں
جو چاہیں رحمت باری تو قہر ہو جائے

(فغان دہلی)

منیر شکوہ آبادی بھی ایسے ہی شاعروں میں شامل تھے جنھوں نے اس ہنگامے کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس سے متاثر بھی ہوئے۔ یہ نواب باندہ کے مصاحب تھے، ان کی گرفتاری کے بعد مرزا ولایت حسین کے ساتھ فرخ آباد میں قید کر لیے گئے اور ان پر مقدمہ چلتا رہا۔ اس کی تفصیل خود ان کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیں۔

فرخ آباد اور یاران شفیق   چھٹ گئے سب گردش تقدیر سے
آئے باندے میں مقید ہو کے   سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثل قبر   تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الٰہ آباد لے جائے گئے   ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
جو الٰہ آباد میں گذرے ستم   ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتے کو پیدل رواں   گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں   ناتواں تر تھیں کی تصویر سے
سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے   تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

یہ چند مثالیں کافی ہیں یہ بتانے کے لیے کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اس جنگ آزادی میں عملی طور پر شرکت کی اور اپنے فن سے اور اپنے قلم سے سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے کی بھرپور کوشش کی۔ اردو ادب کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ اس ادب میں اس عہد کی پوری تاریخ موجود ہے جسے اب تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان بنیادی حوالوں کو استعمال کر کے تاریخ کی غلطیوں کو درست کیا جائے تا کہ وہ وطن کے جانباز جنھوں نے اپنی جان و مال کی قربانی پیش کی ہے ان کا نام تو نئی نسل جان سکے۔

عرسِ چشتی

قطب العصر، غوث الدہر، فانی فی اللہ حضرت خواجہ سید عبد اللہ چشتی مودودی علیہ الرحمۃ والرضوان کا سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت قطب الاقطاب، ماہتاب چشت خواجہ قطب الدین مودود چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح ملتا ہے۔ ابن خواجہ سید اسد اللہ سلطان گنج نشین قدس سرہ ابن حضرت خواجہ برہان الدین چشتی قدس سرہٗ ابن حضرت خواجہ عبد الرحمٰن چشتی قدس سرہٗ ابن حضرت خواجہ محمد جان چشتی قدس سرہٗ ابن حضرت خواجہ سمعان چشتی قدس سرہٗ ابن حضرت خواجہ منصور چشتی قدس سرہٗ ابن حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حسب دستور قدیم امسال بھی آپ کے عرس مبارک کے ساتھ حضرت سلطان العارفین سید شاہ سلطان احمد چشتی علیہ الرحمۃ والرضوان و قطب الملۃ حضرت سید شاہ قطب الدین احمد چشتی علیہ الرحمہ کا سالانہ عرس مبارک مورخہ ۱۴/۱۵/ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۹، ۳۰ جولائی ۲۰۰۷ بروز اتوار/ پیر آستانہ عالیہ چشتیہ شیخ پورہ نوادہ، بہار میں منعقد کیا جائے گا۔

الملتمس: السید عین الدین چشتی المودودی
خانقاہ چشتیہ، چھوٹا شیخپورہ، ہنسوا، نوادہ (بہار) ۰۶۳۲۴۔۲۴۷۷۲۰

مولانا یٰسین اختر مصباحی☆

علماء و قائدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

انقلاب ۱۸۵۷ء میں علما نے مذہبی فریضہ کے طور پر انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتاوی جاری کیے اور عملی طور پر بھی جنگ میں شریک ہو کر مجاہدین کے حوصلے بڑھائے اور انقلابیوں کی بھرپور قیادت کی جن میں مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی کا نام سب سے نمایاں ہے جو اپنے پیر و مرشد حضرت محراب شاہ قلندر گوالیاری کے حکم پر تقریباً ۱۸۴۶ء سے انگریزوں کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔ دیگر مشہور علماے انقلاب ۱۸۵۷ء میں چند سربرآوردہ حضرات کے نام یہ ہیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، علامہ فضل حق خیرآبادی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی۔ تاریخ انقلاب پر لکھی گئی کتابوں کے عام اندازہ کے مطابق لگ بھگ پندرہ ہزار علما جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شہید کیے گئے تھے۔

مذکورہ علما کو جن علما و مشائخ سلف سے کسی نہ کسی شکل میں فکری و عملی رہنمائی ملی ان میں سے چند اہم نام درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) (۲) حضرت مرزا مظہر جان جاناں مجددی دہلوی (متوفی ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء) (۳) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) (۴) حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) (۵) حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء) (۶) حضرت مفتی محمد عوض بریلوی (متوفی ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء) (۷) حضرت مفتی شرف الدین رام پوری (متوفی ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۲ء)

۲۰۰۷ء میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے ڈیڑھ سو سال پورے ہو رہے ہیں اور پورا ملک جنگ آزادی ۱۸۵۷ء جو صحیح معنوں میں پہلی جنگ ہے اس کی یاد منا رہا ہے اور سارے ہندوستانی باشندے اپنے جاں باز انقلابیوں اور سرفروش مجاہدوں کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ اس تاریخی موقعہ پر ان چند مشاہیر علما کا نہایت اختصار و اجمال کے ساتھ یہاں تعارف کرایا جا رہا ہے جن کی یاد سے ہماری روح میں تازگی و توانائی اور حرارت و تپش کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی ۔ مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (متولد ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء۔ متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) کشمیری نسل کے دہلوی عالم و فاضل تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی (متوفی ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء) سے آپ نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۶ء تک آپ دہلی کے صدر امین اور ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۷ء تک صدر الصدور تھے۔ انگریزی عہد حکومت میں دہلی کا صدر الصدور ہونا کسی مسلمان عالم کے لیے سب سے بڑا عہدہ تھا۔ آپ کا دولت کدہ دہلی کے علما و فضلا و ادبا و شعرا کا مرکز اور مرجع تھا۔ سر سید احمد خاں (متوفی ذوالقعدہ ۱۳۱۵ھ/ مارچ ۱۸۹۸ء) نے اپنی مشہور تاریخی کتاب ''آثار الصنادید'' (ص ۵۲۴) مطبوعہ دہلی میں آپ کو اپنے زمانے کا جامع الصفات عالم و فاضل لکھا ہے۔ حکیم عبدالحی رائے بریلوی (متوفی ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء) سابق ناظم دارالعلوم ندوہ لکھنؤ لکھتے ہیں کہ ''مفتی صدرالدین خان بہادر، عالی خاندان، والا دودمان، سرمایۂ نازش ہندوستان، فضل و کمال اور فنون ادبیہ میں آپ اپنا جواب تھے۔'' (۲۲۷۔ گل رعنا مطبوعہ اعظم گڈھ)

۱۸۵۷ء میں علما نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا کئی بار اور کئی جگہ فتویٰ دیا تھا۔ ایک فتویٰ پر مفتی صدرالدین آزردہ کا دستخط ہے جو اخبار الظفر دہلی میں چھپا پھر اس کی نقل صادق الاخبار دہلی مورخہ ۲۶؍ جولائی ۱۸۵۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ اخبار نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ انقلاب کے دوران مفتی آزردہ لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کے پاس آتے جاتے رہے اور انقلابی مجاہدین بھی آپ سے ہدایت حاصل کرنے آپ کے گھر آتے جاتے رہے (روزنامچہ منشی جیون لال مطبوعہ دہلی و روزنامچہ عبداللطیف مطبوعہ دہلی)

☆Founder Darul Qalam, Qadri Masjid, Jogabai Ext Okhla, New Delhi-25

شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے جنوب میں مغل بادشاہ شاہجہاں نے دارالبقا کے نام سے ایک مدرسہ بنوایا تھا جو گردش زمانہ سے ویران ہو گیا تھا اسے مفتی صدرالدین آزردہ نے بہادر شاہ ظفر سے لے کر آباد کیا اور تعلیم کا سلسلہ از سر نو شروع کیا۔ (ص ۲۸۲۔ آثار الصنادید مؤلفہ سرسید)

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین دہلوی اور دادا شیخ محمد ہادی دہلوی مفتی آزردہ کے شاگرد تھے۔ اسی طرح مفتی سعد اللہ مرادآبادی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، نواب یوسف علی خاں والی ریاست رام پور، نواب ضیاء الدین خاں نیر، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولوی سمیع اللہ دہلوی، مولوی فقیر محمد جہلمی اور بعد کے ہونے والے اکابر علمائے دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ آپ کے شاگرد ہیں۔ آپ نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ عربی و فارسی کے علاوہ اردو زبان کے آپ بہترین شاعر تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں انگریز جب غالب آگئے تو آپ کے خلاف مقدمۂ بغاوت چلا۔ بڑی کوشش پیروی اور قید و بند کے بعد کسی طرح آپ کو نجات ملی۔ مگر جائداد کا بڑا حصہ ضبط ہو گیا۔ اپنے ذاتی سرمایہ سے آپ نے تین لاکھ روپے کی نہایت اہم اور نادر کتابیں اپنی ذاتی لائبریری میں جمع کی تھیں جو انقلاب کے دوران ضائع ہو گئیں۔

جامع مسجد دہلی کو انگریزوں نے انقلاب کی ناکامی کے بعد قبضہ کر کے اسے اصطبل بنا دیا تھا۔ مفتی آزردہ نے عمائد شہر کے ساتھ مل کر اس کی واگذاری کی مسلسل کوشش کی جس کے نتیجے میں نومبر ۱۸۶۳ء میں ایک معاہدہ کے تحت انگریزوں نے اسے واگذار کیا۔ (ص ۴۸۔ غدر کے چند علما مؤلفہ انتظام اللہ شہابی مطبوعہ دہلی)۔ مکاتیب غالب میں بھی مسجد کی واگذاری کا ذکر ہے۔

مفتی آزردہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ تقریباً ۱۸۴۶ء میں انھوں نے اپنے خط کے ساتھ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) کو آگرہ بھیجا جہاں انھوں نے "مجلس علما" قائم کر کے انگریزوں سے ہندوستان کو پاک کرنے کی مسلسل تحریک چلائی اور انقلاب ۱۸۵۷ء میں ان علمانے مختلف محاذ پر انگریزوں سے جم کر مقابلہ کیا۔

اکیاسی سال کی عمر میں ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء میں دہلی کے اندر مفتی آزردہ کا انتقال ہوا اور چراغ دہلی میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

علامہ فضل حق خیرآبادی - علامہ فضل حق خیرآبادی (متولد ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء۔ متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) فرزند علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی صدر الصدور دہلی (متوفی ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء) علوم اسلامیہ میں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء) و شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور علوم عقلیہ میں اپنے نامور والد ماجد کے شاگرد تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں تکمیل علوم و فنون کے بعد درس و تدریس میں مصروف ہوئے اور ۱۸۱۵ء میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔

نواب فیض محمد خاں والی ریاست جھجھر (پنجاب) کی دعوت پر جب آپ ۱۸۳۱ء میں دہلی چھوڑ کر جھجھر جانے لگے تو بہادر شاہ ظفر نے نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنا ایک دوشالہ آپ کو اڑھا کر پرنم آنکھوں سے وداع کرتے ہوئے کہا۔ چوں کہ آپ جانے کو تیار ہیں اس لئے اب اس کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی اسے منظور کروں مگر اللہ جانتا ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔ (یادگار غالب مطبوعہ دہلی)

جھجھر کے بعد ریاست الور و ٹونک و رام پور میں ملازمت کے بعد آخر میں آپ لکھنؤ گئے اور وہاں صدر الصدور اور مہتمم "حضور تحصیل" ہوئے۔ دہلی میں بھی عرصہ تک آپ سر رشتہ دار رہے۔ دو سال تک سہارن پور میں بھی کسی عہدہ پر فائز رہے۔ آپ نے کئی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں اور آپ کے کئی ایک شاگرد اپنے دور کے مشاہیر علما و فضلا میں شمار ہوتے ہیں۔

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی و علامہ فضل حق خیرآبادی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کے درمیان گہری دوستی تھی۔ علامہ ہی کے مشورے اور آپ کے انتخاب پر دیوان غالب عالم وجود میں آیا جو بقول محمد حسین آزاد۔ "یہی وہ دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ (آب حیات مطبوعہ دہلی) علامہ فضل حق اور مفتی صدرالدین آزردہ کا گھر دہلی کے علما و فضلا و ادبا و شعرا کا مرکز تھا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء شروع ہوا تو آپ ریاست الور سے دہلی کئی بار آئے گئے۔ بہادر شاہ ظفر سے ملاقاتیں کیں۔ یہ سلسلہ مئی سے جاری رہا۔ پھر ۲۶ جون یا پہلی جولائی کو جنرل بخت خاں روہیلہ جب بریلی سے چودہ ہزار فوج لے کر دہلی پہنچا تو منشی ذکاء اللہ دہلوی کے بیان کے مطابق علامہ نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں علما کے سامنے تقریر

ی۔ استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے۔ اس فتوئی کے شایع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی۔ (تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ مطبوعہ دہلی)

دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد کسی طرح یہاں سے نکل کر آپ اودھ پہنچے۔ ۱۸۵۹ء میں آپ پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور کالا پانی کی سزا ہوئی۔ آپ نے اپنا مقدمہ خود لڑا اور عدالت میں کہا کہ جہاد کا فتوئی میرا لکھا ہوا ہے اور میں آج بھی اپنے اس فتوئی پر قائم ہوں۔

علامہ فضل حق کے صاحبزادے مولانا عبد الحق خیر آبادی (متولد ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء۔ متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بارے میں ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر لکھتا ہے کہ یہ ۱۸۵۷ء کے غدار عالم کے بیٹے ہیں جنھیں حکومت نے کالا پانی کی سزا دی اور اس کا کتب خانہ ضبط کرلیا جو کلکتہ کالج میں موجود ہے۔ (۲۰۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان، مطبوعہ نئی دہلی)

علامہ کے سوانح نگار اور الثورۃ الھندیہ (باغی ہندوستان) کے مترجم مولانا عبد الشاہد شیروانی علی گڑھی لکھتے ہیں کہ:

مولانا عبد الحق خیر آبادی نے وصیت کی تھی کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو میری قبر پر آکر اس کی اطلاع دے دی جائے چنانچہ سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی نے مولانا کے مدفن درگاہ مخدومیہ خیر آباد ضلع سیتا پور اودھ میں ایک جم غفیر کے ساتھ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو حاضر ہوکر میلاد شریف کے بعد قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ (ص ۱۲۔ مقدمہ زبدۃ الحکمۃ۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۴۹ء)

علامہ فضل حق کا جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) میں ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی:—دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متولد ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۷ء۔ شہید ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) چینا پٹن تعلقہ پورنا ملی جنوبی ہند کے نواب محمد علی مشیر ومصاحب سلطان ٹیپو کے فرزند تھے۔ اپنے عقیدت مندوں اور مریدوں کے ساتھ جب مولانا مدراسی کہیں نکلتے تو ایک دستہ نقارہ اور ڈنکا پیٹتا ہوا ساتھ ساتھ چلتا تھا اسی لئے آپ کو ڈنکا شاہ اور نقارہ شاہ بھی کہا جاتا تھا۔

عہد شباب ہی میں آپ پر فقر وتصوف کا غلبہ ہوا اور ریاضت و مجاہدہ کے لئے گھر بار چھوڑ کر حیدر آباد دکن اور مدراس وغیرہ ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ گئے۔ وہاں سے مصر گئے اور پھر حجاز پہنچ کر حج وزیارت کے بعد ترکی وایران وافغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔

بیکانیر وسانبھر میں بارہ سال تک ریاضت ومجاہدہ اور چلہ کشی کی۔ پھر جے پور آکر میر قربان علی شاہ چشتی کے مرید ہوئے اور خلافت سے سرفراز کیے گئے۔ یہاں سے ٹونک گئے وہاں آپ کی مجالس سماع سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہوا جس سے دل برداشتہ ہوکر گوالیار کا سفر کیا وہاں محراب شاہ قلندر گوالیاری کی خدمت میں پہنچے اور اس حکم کے ساتھ آپ کو محراب شاہ نے اجازت وخلافت دی کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے ہر حال میں آزاد کرانا ہے۔ اسی ارادہ سے آپ تقریباً ۱۸۴۶ء میں گوالیار سے دہلی پہنچے۔

دہلی کے مشاہیر علماء ومشائخ سے آپ نے ملاقات وگفتگو کی۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے مشورہ دیا کہ اس مہم کے لئے ماحول سازی آگرہ کے اندر بہتر اور مؤثر طریقے سے ہوسکتی ہے۔ ساتھ ہی مفتی آزردہ نے مفتی انعام اللہ سرکاری وکیل آگرہ (ساکن گوپامئو ضلع ہردوئی۔ متوفی ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۹ء آگرہ) کے نام ایک سفارشی خط بھی لکھا۔ آگرہ پہنچ کر آپ نے دینی وعلمی شخصیات اور سربرآوردہ حضرات سے رابطہ قائم کیا۔ آپ کا اثر روز بروز بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ مجلس علما آگرہ قائم کرکے آگرہ کے علما کو آپ نے مربوط ومنظم کیا۔ یہ علما آپ کے دست وبازو بن گئے۔

مولانا مدراسی نے دہلی وآگرہ کے بعد میرٹھ، پٹنہ، کلکتہ وغیرہ کے بھی دورے کیے اور انگریزوں کے خلاف مہم کا دائرہ کافی وسیع کرلیا۔ سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:

تحریک ۱۸۵۷ء کے لئے پورے ملک کو تیار کرنے میں مولانا شاہ احمد اللہ کا نام سر فہرست آتا ہے۔ وہ ملک کے گوشے گوشے میں دورے کرکے بغاوت کے لئے عوام کو آمادہ کر رہے تھے۔

میلسن (Malleson) لکھتا ہے کہ بے شک اس تمام سازش کا رہنما مولوی (احمد اللہ) تھا اور یہ سازش تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی شخص بغاوت کی سازش کا دماغ و دست وبازو تھا۔ اپنے سفر کے دوران اسی نے وہ اسکیم تیار کی جو چپاتی اسکیم کہلاتی ہے۔ (ص ۲۰۵۔ تاریخ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء۔ مطبوعہ

رضا لائبریری رام پور)

لکھنؤ، فیض آباد، شاہجہاں پور میں مولانا مدراسی نے انگریزوں سے گھمسان کی جنگ لڑی۔ آخر میں محمدی (شاہجہاں پور) میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، شہزادہ فیروز شاہ، جنرل بخت خاں، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی وغیرہ نے اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ مگر راجہ بلدیو سنگھ کی غداری کی وجہ سے مولانا مدراسی اپنی مہم میں ناکام ہوکر ۱۸۵۸ء میں شہید ہو گئے اور بلدیو سنگھ کو انگریزوں نے پچاس ہزار روپے کا انعام دیا۔ پروفیسر محمد ایوب قادری بدایونی (کراچی) لکھتے ہیں کہ

شاہ احمد اللہ صاحب کی شہادت پر روہیل کھنڈ کی ہی جنگ آزادی نہیں بلکہ درحقیقت ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ختم ہوگئی۔ (ص ۳۰۲۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ مطبوعہ کراچی)

انگریز مؤرخ جی ڈبلیو فارسٹر لکھتا ہے۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا۔ اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ (ہسٹری دی انڈین میوٹنی)

مولانا فیض احمد بدایونی:۔ مولانا فیض احمد بدایونی (متولد ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء۔ متوفی نامعلوم) کی تعلیم و تربیت آپ کے ماموں علامہ فضل رسول عثمانی بدایونی (متوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) کی سرپرستی و نگرانی میں ہوئی۔ چودہ سال کی عمر میں تکمیل علوم و فنون سے فارغ ہوئے۔ اپنے وقت کے بڑے عالم و فاضل اور بہترین شاعر تھے۔ اپنے نانا شاہ عبدالحمید عثمانی بدایونی (متوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۲۰ء) سے بیعت تھے۔

بدایوں میں ایک مدت تک درس و تدریس کے بعد صدر نظامت آگرہ میں پیش کار اور پھر بورڈ آف ریونیو کے سررشتہ دار ہوئے۔ سر ولیم میور نے آپ سے عربی زبان سیکھی تھی جو بعد میں ملٹری مجسٹریٹ اور لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ و آگرہ ہوئے۔

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) کی مجلس علما آگرہ کے آپ سرگرم رکن تھے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی (متوفی ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء) اور پادری فنڈر کے درمیان اسلام اور عیسائیت کے موضوع پر ۱۸۵۴ء میں ہونے والے مناظرہ آگرہ میں آپ معاون مناظرہ تھے جو تین روز تک جاری رہا اور پادری فنڈر شکست کھا کر یورپ واپس چلے گئے۔

جامع مسجد آگرہ جس کے اکثر حصے پر لوگوں نے قبضہ رکھا تھا اسے خالی کرانے کے لئے مولانا فیض احمد نے طویل جد و جہد کی۔ مقدمہ بازی بھی ہوئی۔ بالآخر آپ کو کامیابی ملی۔ مسجد کو قابضوں سے خالی کرا کے اس کی مرمت کرائی گئی اور مسجد کے انتظام کے لئے لوکل ایجنسی آگرہ کا قیام عمل میں آیا جس نے ساری ذمہ داری سنبھال لی۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر دہلی پہنچے اور یہاں جاری جنگ میں کھل کر حصہ لیا۔ کچھ دن تک شہزادہ مرزا مغل فرزند بہادر شاہ ظفر کے پیش کار رہے اور جنرل بخت خاں روہیلہ کے ساتھ انقلاب کی ناکامی کے بعد دہلی سے واپس چلے گئے۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں مولانا نے ککرالہ (بدایوں) کے معرکے میں جنرل بخت خاں کے ساتھ داد شجاعت دی جہاں انگریز جنرل پینی میدان جنگ میں مارا گیا۔ یہاں کی پسپائی کے بعد آپ بریلی چلے گئے جہاں خان بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ انگریزوں سے برسرپیکار تھے۔

لکھنؤ میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ بھی آپ رہے اور انگریزوں سے جنگ کی۔ یہاں سے مولانا مدراسی کے ساتھ شاہجہاں پور گئے اور جب مولانا مدراسی نے محمدی (شاہ جہاں پور) میں اپنی حکومت قایم کی تو اس کی وزارت میں شامل ہوئے۔ شاہجہاں پور پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد آپ نیپال کی طرف نکل گئے اور پھر بعد کے حالات کا کچھ علم نہیں کہ آپ پر کیا گذری اور کہاں کس طرح آپ کا انتقال ہوا؟

پروفیسر محمد ایوب قادری بدایونی (کراچی) لکھتے ہیں کہ

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں علمائے بدایوں نے نمایاں حصہ لیا۔ ان میں سرفہرست مولانا فیض احمد بدایونی کا نام ہے جو اپنے دور کے نامور عالم تھے۔ سینٹرل بورڈ آف ریونیو میں ملازم تھے۔ عربی کے بلند پایہ ادیب و شاعر تھے۔ انھوں نے آگرہ میں قیام کے دوران مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر کے مناظرہ میں حصہ لیا اور مولوی رحمت اللہ کے مددگار رہے۔ پھر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ وہ دہلی بھی گئے۔ آخری معرکہ ککرالہ (بدایوں) میں ہوا۔ اس میں ڈاکٹر وزیر خاں، شہزادہ فیروز شاہ جیسے بطل حریت بھی موجود تھے۔ انگریزوں کا مشہور جنرل پینی مارا گیا۔ (ص ۲۶۔ انسائیکلوپیڈیا آف بدایوں، جلد ۲۔ مطبوعہ کراچی)

مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی:۔ مولانا سید کفایت

علی کافی مرادآبادی (شہید ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) عالم و فاضل اور بہترین طبیب و شاعر تھے۔ شاہ ابوسعید مجددی رام پوری (متوفی ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء) سے مولانا کافی نے درس حدیث لیا اور مشہور شاعر ذکی مرادآبادی (متوفی ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء) شاگرد امام بخش ناسخ سے فن شاعری سیکھا۔

۱۸۴۱ء میں آپ نے حج و زیارت کی سعادت حاصل کی جس کی یادگار "تجلی در بار رحمت" ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کئی تصانیف ہیں۔ مثلاً ترجمہ شمائل ترمذی (منظوم) مجموعہ چہل حدیث (منظوم) مع تشریح، خیابان فردوس، بہار خلد، نسیم جنت، مولود بہار، جذب عشق، دیوان کافی۔

آپ کی نعتیہ شاعری اور جذبۂ عشق رسول کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے امام احمد رضا بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) کہتے ہیں۔

مہکا ہے مری بوئے دہن سے عالم
یاں نغمۂ شیریں نہیں تلخی سے بہم
کافی "سلطان نعت گویاں" ہیں رضا
ان شاء اللہ میں وزیر اعظم

مرادآباد میں آپ نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے وقت انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ اور اس کی نقلیں دوسرے مقامات پر بھجوائیں۔ خود آنولہ (بریلی) جا کر ایک ہفتہ قیام کیا اور فتویٰ کی تشہیر کے ساتھ لوگوں میں جذبۂ جہاد ابھارا۔ یہاں سے بریلی پہنچے اور خان بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ سے تبادلۂ خیال کیا پھر مرادآباد واپس آئے۔

نواب مجد الدین خاں عرف مجو خاں کی قیادت میں مرادآباد کے اندر حکومت قائم ہوئی تو مولانا کافی اس کے صدر شریعت بنائے گئے۔ ڈسٹرکٹ گزٹ مرادآباد میں ہے کہ یہاں ضلع بھر میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف زبردست بغاوت کی جس کے پیچھے ان کا مذہبی جذبہ کارفرما تھا۔

اس وقت ریاست رام پور کے نواب یوسف علی خاں انگریزوں کی حمایت و وفاداری میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے مرادآباد پر حملہ کیا مگر جنرل بخت خاں جب اپنی فوج کے ساتھ مرادآباد پہنچے تو نواب کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ تاہم بعد میں نواب نے انگریزوں کی مدد سے مرادآباد پر قبضہ کر لیا اور انگریزوں نے نواب مجو خاں کو طرح طرح کی اذیت دے کر شہید کر دیا۔

مولانا کافی اپنے خط کے ذریعہ جنرل بخت خاں کو مرادآباد کے حالات سے باخبر کرتے رہتے تھے۔ ۲۵؍ اپریل ۵۸ء کو جب مرادآباد پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا تو مولانا روپوش ہو گئے۔ مگر ایک مخبر کی غداری سے ۳۰؍ اپریل کو انگریزوں نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ اس وقت انگریزوں نے ایک کمیشن قائم کیا تھا جو مقدمات کی سرسری سماعت کر کے سزا سنایا کرتا تھا۔ ۴؍ مئی ۱۸۵۸ء کو مولانا کا مقدمہ ظالم و جابر انگریز مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوا اور بہت جلد اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ (اخبار الصنادید مؤلفہ نجم الغنی رام پوری مطبوعہ رام پور)

مسٹر جان انگلسن مجسٹریٹ کمیشن مرادآباد نے فیصلہ سنایا کہ۔

"چوں کہ اس مدعا علیہ ملزم نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور عوام کو قانونی حکومت کے خلاف ورغلایا اور شہر میں لوٹ مار کی۔ ملزم کا یہ فعل صریح بغاوت انگریزی سرکار ہوا جس کی پاداش میں ملزم کو سزائے کامل دی جائے۔

حکم ہوا— مدعا علیہ کو پھانسی دے کر جان سے مارا جائے۔

جان انگلسن۔ ۶؍ مئی ۱۸۵۸ء۔

مقدمہ کی پوری کارروائی صرف دو دن میں پوری کر دی گئی۔ ۴؍ مئی کو پیش ہوا اور ۶؍ مئی کو حکم دے دیا گیا اور اسی وقت پھانسی دے دی گئی۔ (ص ۱۴۴۔ مرادآباد: تاریخ جد و جہد آزادی مؤلفہ سید محبوب حسین سبزواری مرادآبادی۔ مطبوعہ مرادآباد)

پھانسی کے وقت آپ وجد و شوق کے ساتھ نعت شریف پڑھ رہے تھے۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی (متولد ۱۲۲۸ھ/ ۱۸۱۳ء۔ متوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء) دیوہ (بارہ بنکی، اودھ) میں پیدا ہوئے اور اپنی ننھیال کاکوری (لکھنؤ) میں اپنے والد منشی محمد بخش کے ساتھ مستقل رہائش پذیر ہوئے۔ دیوہ اور کاکوری میں ابتدائی تعلیم کے بعد رام پور پہنچ کر مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی میں شاہ محمد اسحٰق (متوفی ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۸ء) اور علی گڑھ میں مولانا بزرگ علی مارہروی (۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۸ء) سے درس حدیث اور دیگر علوم پڑھ کر علی گڑھ میں مدرس اور مفتی کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ کے بہت سے شاگردوں میں مفتی لطف اللہ علی گڑھی (متوفی ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء) صدر الصدور امور مذہبی حیدرآباد دکن زیادہ مشہور ہوئے۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی نے سرکاری ملازمت بھی کی۔ پہلے علی گڑھ میں منصف ہوئے کچھ عرصہ پھپھوند (اٹاوہ) میں بھی منصف رہے

پھر صدر امین بن کر بریلی گئے۔ وہاں آپ زیادہ دنوں تک رہے اور کئی ایک دینی وعلمی کتابیں بھی لکھیں۔ یہاں آپ نے ایک اصلاحی اور تبلیغی انجمن "جلسۂ تائید دین متین" قائم کر کے لٹریچر کی نشر واشاعت کی۔ اس انجمن کو برصغیر کی پہلی اصلاحی انجمن کہا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے شروع میں آپ کو صدر الصدور آگرہ بنایا گیا۔ ابھی سفر کی تیاری جاری تھی کہ ماہ مئی میں انقلاب برپا ہو گیا اور آپ آگرہ نہ جا کر بریلی ورام پور میں انقلابیوں کے ہمنوا ومعاون بلکہ سرپرست کی حیثیت سے سرگرم ہو گئے۔

مجاہدین کے لئے مالی امداد وتعاون اور انگریزوں کے خلاف جہاد پر مشتمل ایک فتویٰ بریلی سے جاری ہوا جس پر مفتی عنایت احمد کاکوروی کے دستخط تھے۔ پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں۔ انقلاب سے پہلے بریلی میں اس تحریک کے دو ممتاز کارکن موجود تھے۔ مولوی سرفراز علی اور دوسرے مفتی عنایت احمد کاکوروی (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ مطبوعہ کراچی)

میاں عبدالرشید کالم نگار روزنامہ نوائے وقت لاہور لکھتے ہیں——

آپ (مفتی عنایت احمد) بریلی میں نواب خان بہادر خاں روہیلہ کی قیادت میں جہاد حریت کی تنظیم کے لئے سرگرم عمل رہے۔ ان دنوں روہیل کھنڈ بریلی مجاہدین آزادی کا اہم مرکز تھا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے دادا مولانا رضا علی خاں بریلوی اس تحریک کے قائدین میں سے تھے۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی نے مجاہدین کی تنظیم پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ نواب خان بہادر خاں روہیلہ کے دست وبازو کی حیثیت سے مختلف معرکوں میں عملی حصہ بھی لیا۔ (جنگ آزادی نمبر۔ ماہنامہ ترجمان اہل سنت کراچی۔ شمارہ جولائی ۱۹۷۵ء)

فتویٰ اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں انگریزوں نے آپ کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا اور کالا پانی کی سزا دی۔ جہاں چار سال قید وبند کی آپ نے مشقت جھیلی۔ ایک انگریز کی فرمائش پر "تقویم البلدان" کے ترجمہ کی خدمت انجام دینے کے صلے میں آپ کو رہائی ملی اور ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں ہندوستان واپس آ کر کانپور میں ایک مدرسہ (فیض عام) کی بنیاد ڈالی اور دینی وعلمی خدمات میں مصروف ہو گئے۔

کالا پانی میں آپ نے سیرت النبی پر ایک مختصر کتاب "تواریخ حبیب الٰہ" اور فن صرف کی کتاب "علم الصیغہ" تحریر کی جو آج بھی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی آپ کی لکھی ہوئی لگ بھگ دو درجن کتابیں ہیں۔

اپنے مدرسہ فیض عام کان پور کی کچھ خدمت کر کے آپ حج وزیارت حرمین شریفین کی نیت سے حجاز مقدس کے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں مشیت الٰہی سے بحری جہاز غرق ہو گیا اور ۱۷ شوال ۱۲۷۹ھ/ ۱۷ اپریل ۱۸۶۳ء میں آپ شہید اور غریق بحر رحمت ہو گئے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی: – پاسبان حرمین مولانا رحمت اللہ عثمانی کیرانوی (متولد ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء۔ متوفی ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء) کبیر الاولیا مخدوم جلال الدین پانی پتی (متوفی ۷۶۵ھ) کی اولاد میں سے ایک بلند پایہ عالم دین ہیں۔ کیرانہ مظفر نگر (موجودہ مغربی یوپی) میں ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ حیات دہلی میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ پھر لکھنؤ جا کر مفتی سعد اللہ مراد آبادی (متوفی ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء۔ شاگرد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ومفتی صدر الدین آزردہ دہلوی) سے چند اعلیٰ کتابوں کا درس لیا۔ شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی (متوفی ۱۲۹۶ھ/ دسمبر ۱۸۷۸ء) سے حدیث نبوی کی کئی کتابیں پڑھیں۔

شروع میں کئی سال تک کیرانہ کی مسجد میں طلبہ کو پڑھایا۔ مشنری اسکولوں اور پادریوں کی سرگرمیاں جب زیادہ بڑھنے لگیں اور انہوں نے اسلام پر اعتراضات کیے تو شاہ عبدالغنی مجددی کے حکم پر "ازالۃ الاوہام" کے نام سے آپ نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں عیسائیوں بالخصوص پادری فنڈر کی لکھی ہوئی کتاب "میزان الحق" کے سارے اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا۔

۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء میں مولانا کیرانوی اور پادری فنڈر کے درمیان آگرہ میں ایک تاریخی مناظرہ ہوا جس میں پادری فنڈر کو آپ نے لاجواب کر دیا۔ اس مناظرہ کی تفصیلات اسی وقت کتابوں میں شائع ہو گئیں۔ اس مناظرہ میں مولانا فیض احمد بدایونی اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی آپ کے خصوصی معاون تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء شروع ہوا تو آپ نے انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کی۔ مولانا امداد صابری دہلوی لکھتے ہیں—— اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم وتربیت کے لئے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا اور اعلان ہوتا تھا کہ۔ ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا۔ (ص ۲۴۹۔ آثار رحمت مطبوعہ دہلی)

مولوی رحمت اللہ صاحب کا دہلی کے علمی طبقے اور لال قلعہ کے شہزادوں پر اثر اور ان سے تعلقات تھے اس لئے اس وقت، بہادر شاہ ظفر

اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی جنگ آزادی کا نقشہ بنانے میں حصہ لیا اور جنگ میں شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی کے ساتھ دہلی کی جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔ (ص ۳۱۹۔ آثار رحمت مطبوعہ دہلی)

منشی ذکاء اللہ دہلوی نے لکھا سب سے اول مولوی رحمت اللہ کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے؟ وہ بڑے فاضل تھے۔ (ص ۶۷۵ جلد سوم۔ تاریخ عروج عہد انگلشیہ، مطبوعہ دہلی)

روزنامچہ عبداللطیف میں ہے۔ دو سو اہل نجیب آباد مولوی رحمت اللہ کیرانوی کی قیادت میں دہلی آئے اور آمادۂ پیکار ہوئے۔ پھر واپس چلے گئے۔ (ص ۸۷۔ روزنامچہ عبداللطیف، مطبوعہ دہلی)

بعد میں انگریزوں نے آپ کے خلاف مقدمہ چلایا اور اعلان کیا کہ مولانا کیرانوی کو گرفتار کر کے انھیں انگریزوں کے حوالہ کرنے والے شخص کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔ مگر مولانا کیرانوی گرفتار نہ کیے جا سکے اور کسی طرح بچتے بچاتے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ کیرانہ میں آپ کی جائداد و ملکیت ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ اسی طرح پانی پت کی آپ کی موروثی جائداد بھی نیلام کر دی گئی۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر آپ نے مدرسہ صولتیہ قائم کیا اور درس و تدریس میں معروف ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور شیخ زینی دحلان شافعی مکی نے وہاں آپ کو کافی سہارا دیا۔ سلطان ترکی کی دعوت پر کئی بار آپ نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ انھیں کی خواہش پر آپ نے رد نصرانیت میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''اظہار الحق'' مکہ مکرمہ میں لکھ کر پادریوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ ۱۸۹۱ء میں مکہ مکرمہ میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں آپ کی تدفین ہوئی۔

مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی — مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) بہار کے رہنے والے تھے۔ والد محمد نذیر خاں نے ابتدائی تعلیم کے بعد مرشدآباد (بنگال) میں انگریزی تعلیم دلائی اور پھر انگلینڈ بھیج دیا جہاں محنت سے آپ نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ ساتھ ہی یونانی و عبرانی زبانیں سیکھیں اور انجیل و توریت وغیرہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔

ہندوستان واپسی کے بعد کلکتہ کے ایک اسپتال میں حکومت کی طرف سے اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آگرہ آ گئے۔ یہاں اپنے کام کے ساتھ مفتی انعام اللہ گوپاموی وکیل صدر سے ربط و ضبط ہوا۔ اور جب مولانا احمد اللہ مدراسی نے مجلس علما آگرہ بنا کر اپنی سرگرمی شروع کی تو آپ ان کے دست و بازو بن گئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر خاں کو انگریز دشمنی اور حریت نوازی کا چسکا شاہ (احمد اللہ مدراسی) صاحب کے فیض صحبت سے پڑا۔
(ص ۸۱۔ غدر کے چند علما، مطبوعہ دہلی)

۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر نے علمائے آگرہ کو چیلنج مناظرہ دیا تو مجلس علما میں مشورہ ہوا اور ڈاکٹر وزیر خاں نے اسے منظور کر کے اپنے دوست مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو بلا بھیجا۔ اور تین روز کے گرما گرم مناظرہ کے بعد پادری فنڈر نے راہ فرار اختیار کی۔ اس مناظرہ میں اہل اسلام کی طرف سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی مناظر مقرر ہوئے تھے اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں و مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی ان کے معاون تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ کی سرگرم شرکت کے بارے میں مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر وزیر خاں مردانہ وار نکل آئے۔ آگرہ میں جو فوج فدائیوں کی آئی اس کی سرپرستی ڈاکٹر صاحب نے کی۔ انگریز قلعہ بند ہو گئے۔ یہ مولوی فیض احمد بدایونی کو لے کر دہلی پہنچے۔ بہادر شاہ کا دربار جما ہوا تھا۔ بریلی سے جنرل بخت خاں آ چکے تھے۔ ''وار کونسل'' بنی ہوئی تھی۔ .... ڈاکٹر صاحب بھی اس میں داخل کر لیے گئے۔ جنرل بخت خاں لارڈ گورنر تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہمراہ لیا۔ مولوی فیض احمد مرزا مغل کے پیش کار مقرر ہوئے۔ (ص ۸۷۔ غدر کے چند علما، مطبوعہ دہلی)

دہلی میں پسپائی کے بعد جنرل بخت روہیلہ، ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ اپنی فوج کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف مورچہ بندی کی۔ پھر سب کو لکھنؤ چھوڑ کر شاہجہاں پور جانا پڑا۔ وہاں بھی جب ناکامی ہوئی تو منتشر ہو کر اکثر حضرات نیپال چلے گئے۔ مولانا ڈاکٹر وزیر خاں چھپتے چھپاتے مکہ مکرمہ پہنچے اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے پاس مکہ مکرمہ ہی میں مقیم ہو گئے۔

مکہ مکرمہ میں مطب کھول کر ڈاکٹر صاحب نے مریضوں کا علاج کرنا شروع کیا۔ ایک عرب شیخ عبداللہ یمنی کی بیوی کا آپ نے علاج کیا اس نے آپ کو پیسے دینے چاہے تو آپ نے لینے سے انکار کیا جس کے بعد وہ آپ کا عقیدت مند ہو گیا۔ انگریزی حکومت نے سلطان ترکی

کو خط لکھا کہ ہمارا ایک مفرور ملزم مکہ میں ہے اس کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ سلطان ترکی نے گورنر مکہ شریف عبداللہ کو لکھا۔ گورنر مکہ کے مشورے سے آپ نے عبداللہ یمنی کو صورت حال بتائی اس نے گورنر مکہ سے کہا کہ میرے قبیلہ کے دس ہزار افراد ہیں جب وہ کٹ مر جائیں گے تبھی ڈاکٹر صاحب کو کسی کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ گورنر مکہ نے یہ بات سلطان ترکی کو لکھ کر مطلع کیا۔ اس نے حکومت ہند کو لکھ دیا کہ ایسے حالات میں اس ملزم کی حوالگی ناممکن ہے۔ حکومت ہند کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب مکہ مکرمہ میں چودہ سال تک بقید حیات رہے۔ وہیں ۱۸۷۳ء میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں تدفین ہوئی۔

مولانا وہاج الدین مرادآبادی -مولانا وہاج الدین عرف مولوی منو مرادآبادی (شہادت ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) شہر کے بڑے عالم اور رئیس تھے۔ قومی جذبہ سے سرشار تھے۔ عوام و خواص آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عربی و فارسی و اردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی آپ کو قدرت تھی۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ نے مرادآباد میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مرادآباد جیل خانہ پر آپ نے ایک ہجوم کے ساتھ حملہ کیا اور سارے قیدیوں کو آزاد کرا لیا۔ مسٹر جان کرافٹ ولسن یہ خبر سنتے ہی روپوش ہو گیا تھا۔

”مرادآباد میں مجاہدین کی پہلی ناکامی کے بعد مولانا وہاج الدین عرف مولوی منو نے عوام کو دوبارہ منظم کیا اور معمولی ہتھیاروں کے ساتھ اپنی قیادت میں مجاہدین کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ جیل کی طرف بڑھے۔ (محاربۂ عظیم۔ مؤلفہ منشی کنھیا لال)

مولانا وہاج الدین نے رام پور کا دورہ کر کے وہاں بھی جہاد اور حریت کی روح پھونکنے کا سرفروشانہ اقدام کیا کیوں کہ نواب رام پور انگریزوں کے وفادار تھے۔ قصبوں اور دیہاتوں میں گھوم کر آپ نے آزادی کا پیغام پہنچایا۔

شہزادہ فیروز شاہ جب مرادآباد پہنچا تو مولانا وہاج الدین اس کے دست راست بن گئے۔ مولانا سید کفایت علی کافیؔ اور مولانا وہاج الدین نے مل جل کر مرادآباد میں انقلاب برپا کر دیا۔ شہزادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں ان حضرات نے نواب کی فوج اور انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

انقلاب کی ناکامی کے بعد ایک مخبر کی غداری سے مولانا وہاج الدین کے گھر پر انگریزوں نے دھاوا بول دیا اور گھر کے اندر ہی گولی مار کر آپ کو شہید کر دیا۔

مولانا امام بخش صہبائی دہلوی -مولانا امام بخش صہبائی دہلوی (شہادت ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) مولانا عبداللہ خاں علوی کے شاگرد اور اردو زبان کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ سرسید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) نے اپنی مشہور کتاب ”آثار الصنادید“ میں آپ کی بڑی تعریف کرتے ہوئے آپ کو علم و فضل کا جامع اور کئی فنون کا ماہر لکھا ہے۔

۱۸۴۰ء میں لفٹننٹ گورنر دہلی نے مفتی صدرالدین آزردہؔ کی نشان دہی پر آپ کو دہلی کالج میں فارسی زبان کا استاذ مقرر کیا۔ مرزا غالب اور صہبائی میں گہری دوستی تھی۔ مفتی آزردہ اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے گھر تقریباً روزانہ ہی صہبائی جایا کرتے تھے جہاں علم و فضل اور شعر و ادب کی محفلیں ہر وقت آراستہ رہا کرتی تھیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

”مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ ان کی تصانیف اب تک پڑھائی جاتی ہیں۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ (ص ۱۶۲۔ مرحوم دلی کالج۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو نئی دہلی)

مولانا صہبائی انگریز مخالف ذہن رکھنے کے ساتھ انقلابیوں اور مجاہدوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے اور قلعۂ معلی کی مجلسوں اور بعض مشوروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے آپ کے محلہ کوچہ چیلان دہلی سے ایک بار چودہ سو آدمیوں کو گرفتار کر کے راج گھاٹ (نئی دہلی) جمنا کنارے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ انھیں میں مولانا صہبائی بھی تھے۔ آپ کے گھر کے اکیس افراد قتل کیے گئے۔

یہ المناک خبر مفتی صدرالدین آزردہؔ نے سنی تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا:

کیوں کر آزردہؔ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائیؔ ہو

☆☆☆

حاصلِ مطالعہ

ادارہ اس کالم میں ہر ماہ اپنے مخصوص احباب کے مطالعہ میں آنے والی اہم تحریروں کا حاصل پیش کرتا ہے..................(ادارہ)

۱۸۵۷ء کی دردناک داستان اور انگریز نواز علماء کی وفاداریاں

مولانا منظر الاسلام ازہری☆

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا تصور بہت بھیانک ہے، آزادی کے حصول کے لئے اہل ہند کو جو قیمت چکانی پڑی وہ اپنی نظیر آپ ہے، کسی کو پھانسی کے پھندوں پر چڑھا دیا گیا، کسی نے توپوں اور گولیوں سے اپنے وجود کے چیتھڑے اڑا کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی، کسی کا جسم تانبے کے پیسے گرم کرکے داغا گیا، کہیں پوری آبادی کو آگ لگادی گئی، کہیں بارہ ہندوستانیوں کے جتھوں کو صرف اس بنا پر اجتماعی سزا دی گئی کہ جب انگریز خائن راستہ سے گزرا تو انہوں نے اپنا رخ پھیر لیا، مسلمانوں کو سور کے چمڑوں میں لپیٹ کر سور کا خون چاٹنے پر مجبور کیا گیا اور پھر انہیں جلا دیا گیا، ہندوؤں کو گائے کا خون چاٹنے پر مجبور کیا گیا اور پھر بھرسٹ کردیا گیا، غرضیکہ آزادی ہند کا تصور کرنے سے وحشت و بربریت کی ایسی بھیانک تاریخ سامنے آتی ہے جس کی مثال کسی مہذب سماج اور کسی دین و مذہب میں نہیں ملتی، ان سب کے باوجود سفید چمڑیوں والوں کا یہ دعوی ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکار ہیں جبکہ یہ سراسر حضرت مسیح کی تعلیمات کے خلاف ہے !!

اس وقت میرے مطالعہ کی میز پر پاکستان کے معروف محقق، درجنوں عربی فارسی کتب کے مترجم علامہ عبد الحکیم اختر شاہجہاں پوری کی کتاب "مشعل راہ" مطبوعہ لاہور ہے، علامہ موصوف نے ایک ہزار سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی اپنی اس تالیف میں بڑی محنت سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہل ہند کے کردار پر روشنی ڈالی ہے، خاص طور پر اس جنگ میں حصہ لینے والے مسلمان علما کا ذکر بہت تفصیل کے ساتھ کیا ہے، ابتداء میں ہے انہوں نے اہالیان ہند کے ساتھ ظلم و بربریت کے گھناؤنے واقعات کا بھی ذکر کیا، میں ان کی اس کتاب کے باب "۱۸۵۷ء کا ٹکراؤ" جو صفحہ ۹۷ تا صفحہ ۱۲۸ پر محیط ہے، کا خلاصہ قارئین کی نذر کرتا ہوں۔

میرٹھ چھاؤنی میں ہندوستانی فوج کے ساتھ برتاؤ:- ۹ رمئی کی صبح طلوع ہوئی، دیسی رسالے کو پیدل پریڈ کے میدان میں آنے کا حکم مل گیا، یورپی فوج کو اور توپ خانے کو اس طرح کھڑا کیا گیا کہ اگر کوئی سپاہی مزاحمت کی خفیف سی بھی حرکت کرے تو توپوں کے منہ کھول دیے جائیں اور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، پچاس مجرموں کو جنہوں نے میرٹھ چھاؤنی میں ۲۴ راپریل ۱۸۵۷ء کو چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا تھا اور جنہیں انگریز سزائے موت سنا چکے تھے، پہرے میں لایا گیا، پریڈ کے میدان میں پہلے ان کی وردیاں اتار دی گئیں، پھر لوہاروں کو حکم دیا گیا کہ ان مجرموں کو بیڑیاں پہنادی جائیں، چنانچہ اس پر عمل ہوا، کیئی نے لکھا ہے کہ یہ منظر بڑا دردناک تھا، ان بدنصیب آدمیوں کے یاس انگیز اشارے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے دل میں ہمدردی کے جذبات متحرک ہوگئے، ان میں ایسے بھی تھے جو فوج کے گل سرسید سمجھے جاتے تھے، وہ سپاہی جنہوں نے حد درجہ امتحانی حالات اور اجنبی مقامات میں حکومت برطانیہ کی خدمات انجام دی تھیں اور ان کی وفاداری میں کبھی تزلزل نہ آیا تھا، قیدی بے ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور بلند آواز کے ساتھ جرنیل سے التجائیں کررہے تھے کہ ہم پر رحم کیجیے اور ذلت خیز سزا نہ دیجئے، جب انہیں امید کی کوئی بھی کرن نظر نہ آئی تو وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوکر برا بھلا کہنے لگے کہ کیوں چپ چاپ کھڑے ہمیں ذلت کا نشانہ بنتے دیکھ رہے ہو؟

دہلی کے باشندوں کی نعش:- ۱۹ رستمبر ۱۸۵۷ء کو لال قلعہ پر انگریز دل نے قبضہ کرلیا، اس درمیان جو بھی ان کے سامنے آتا اسے گولی ماردی جاتی، یہاں دوست، دشمن، ہندو اور مسلم میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی، دہلی کی شاہراہیں لاشوں سے بھر گئیں، کوے اور چیل انسانی ڈھانچوں کو کھا کر مست ہوچکے تھے، ۲۴ رستمبر ۱۸۵۷ء کو جب رابرٹس کانپور جانے لگا تو اس نے دہلی کو بھی گھوم پھر کر دیکھا، رابرٹس کی زبان میں علامہ شاہجہاں پوری غلام رسول مہر کے حوالہ سے اس بربادی کی داستان اس طرح نقل کرتے ہیں

☆200 W Market Centre Dr High Point, N.Carolina (U.S.A) E-mail:manzarulislamq@yahoo com

صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا، لاہوری دروازہ سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گذرے، دہلی حقیقۃً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا، ہمارے اپنے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی، ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری، ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں، ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کردی تھی، ہر نعش تجزیہ و تحلیل کے مختلف مراحل میں تھی، ہم چپ چاپ چلے جارہے تھے یا سمجھ لیجئے کہ بے ارادہ زیر لب باتیں کر رہے تھے تا کہ انسانیت کے اس دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑ جائے، جن مناظر سے ہماری آنکھیں دوچار ہوئیں، وہ بڑے ہی خوفناک اور انتہا درجہ رنج افزا تھے۔

کہیں کوئی کتا کسی نعش کا برہنہ عضو بھنبھوڑ کر کھا رہا تھا، کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑ پھڑاتے پروں سے ذرا دور چلا جاتا تھا لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا، اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے، کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے کسی کو اشارہ کر رہا ہو، دراصل یہ پورا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ معلوم ہوتا ہے ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا، اس لئے وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے، پوری فضاء ناقابل تصور حد تک بھیانک تھی جو بڑی متعفن اور بیماری آور بدبو سے لبریز تھی۔ (ص ۱۰۶)

دہلی میں لوٹ کھسوٹ - جب اہالیان دہلی کی نعشوں کو چیل اور کتوں کی نذر کردیا گیا تو لوٹ اور چوری کا بازار گرم ہوا، انگریز لٹیرے سکھوں کی مدد سے گھروں کے اندر داخل ہو کر قیمتی جواہر بٹورنے میں لگ گئے، علامہ نے غلام رسول مہر کے حوالہ سے لکھا ہے:

فتح کے ساتھ ہی فوج کو تین دن کے لئے لوٹ کی اجازت دے دی گئی تھی، باسورسمتھ نے لکھا ہے کہ اجازت نہ بھی دی جاتی تو سپاہ اس حالت میں بھی باز نہ رہتی، سکھوں اور دوسرے لوگوں کو معلوم تھا کہ دہلی میں اعلیٰ قیمتی سامان، جواہرات، سونے چاندی کے برتنوں اور روپے کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ شکاری کتوں کی طرح جھولی ڈال کر وہ گلی گلی اور بازار بازار پھر نکلے، ایک بے آباد گھر کے بعد دوسرے میں داخل ہوتے، ہنرمندوں کی طرح آہستہ آہستہ دیواروں اور تختوں پر تھپکیاں مارتے، فرش پر پانی ڈالتے اور دیکھتے رہتے کہ کہاں جلد مرتا ہے، پھر عقاب کی آنکھ یا سرخ ہندوستانی کے کان یا شکاری کتے کی ناک سے کام لے کر سیدھے گڑھے یا تہ خانے یا زمین میں دبے ہوئے برتن نکال لیتے، جن میں عمر بھر یا پشتوں کی بچائی ہوئی پونجی موجود ہوتی۔ (ص ۱۰۸)

یہ تو عام ظلم کی کہانی تھی لیکن خاص دہلی میں مسلمانوں اور مغلیہ خاندان کے افراد کے ساتھ جو ہوا وہ بھی بڑا دل دہلا دینے والا واقعہ ہے، شاہجہانپوری صاحب، "قیصر التواریخ" کے حوالہ سے لکھتے ہیں

ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی، سات دن برابر قتل عام رہا اس کا حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسل تیموریہ کو نہ رکھا، مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورات سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔ (ص ۱۰۸)

ہندو اور مسلمان قیدیوں کے ساتھ برتاؤ: - مسلمان قیدیوں کو سور کا خون چاٹنے پر مجبور کیا جاتا اور ہندوؤں کو گائے کا خون صاف کرنے پر، پھر انہیں گولی ماردی جاتی، غلام رسول مہر کے ہی حوالہ سے علامہ صاحب رقمطراز ہیں:

کرنل نیل نے ایک مکان کے اندر فرش پر علیحدہ علیحدہ گائے اور سور کے خون کا چھڑکاؤ کروایا ہوا تھا، جو حریت پسند گرفتار ہو کر اس کے سامنے پیش کیا جاتا اسے پھانسی دینے سے پہلے یہ تعذیب دی جاتی کہ اگر مسلمان ہے تو اس مکان میں اپنے حصے کا سور کا خون زبان سے چاٹ کر فرش کو صاف کرے، اور اگر قیدی ہندو ہے تو اسے گائے کے خون والی جگہ کا ایک قطعہ اسی طرح صاف کروایا جاتا، جو انکار یا حیل وحجت کرتا تو درے لگتے، انکار کی صورت میں درے مار مار کر اسے ختم کر دیا جاتا ورنہ صاف کرنے کے بعد پھانسی پر لٹکا دیا جاتا، اس طرح موت سے پہلے چند منٹ زندہ رہنے کی مہلت مل جاتی، یہ طریقہ کارنیل نے ۱۸۷۵ء کو جاری کیا تھا، اس طریقہ تعذیب کو ٹیلی سن جلد دوم ص ۳۰۰ سے یوں نقل کیا گیا ہے

بریگیڈیر جنرل نیل کا عزم مصمم ہے کہ بے گناہوں کے خون کا ہر دھبہ ان بدمعاشوں سے قبل از نفاذ سزائے موت صاف کرایا اور دھلوایا جائے جو آئندہ غدر میں سرگرم حصہ لینے کی بنا پر گرفتار ہوں، انہیں حیثیت، ذات اور جرم کی بنا پر اس کام کے لئے منتخب کیا جائے، ہر بدمعاش کو موت کی سزا کا حکم سن لینے کے بعد پہرے کے ساتھ متعلقہ مکان میں لے جایا جائیگا، اور مجبور کیا جائیگا کہ وہ دھبوں کا ایک حصہ صاف کرے۔

بقیہ: صفحہ ۱۴۷ پر ملاحظہ فرمائیں

تبصرہ نگار: مولانا نیاز احمد مصباحی☆

کتاب. انگریز نوازی کی حقیقت

مؤلف مولانا لیٰسین اختر مصباحی، **صفحات.** ۲۰۸، **قیمت.** ۶۰ روپے
ناشر دار القلم ۹۲/۶۶، قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر، جوگابائی ایکسٹینشن، اوکھلا، نئی دہلی-۲۵

ہندوستان کی آزادی کی جنگ مئی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی تھی-اس سال اس کے 150 سال پورے ہو گئے، اس مناسبت سے پورے ملک میں حکومتی و غیر حکومتی سطح پر جشن کا اہتمام کیا گیا، جلسے و جلوس کیے گئے کانفرنسیں منعقد کی گئیں، سمینار اور ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا-

علمائے اہل سنت و جماعت نے وطن کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا- جان و مال تک کی قربانیاں دینے سے گریز نہ کیا- لیکن بعد کے عہد میں اپنوں کی لاپروائی اور غیروں کی عیاری سے ان کے کارنامے پس پردہ چلے گئے اور جن کی زبانیں انگریز سامراج کے قصیدے پڑھنے میں رطب تھیں، انہیں جنگ آزادی کے ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا- اس پورے کھیل میں ہم گویا خاموش تماشائی بنے رہے-

خوشی کا مقام ہے کہ اس سال، جنگ آزادی ۱۵۰ ویں سالگرہ پر ہماری جماعت ماضی کے مقابلے بہت متحرک نظر آئی، مختلف تقریبات کے اہتمام میں کسر باقی نہ رکھی گئی، رسائل و مجلات میں مجاہدین کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے خصوصی مضامین شائع کیے گئے اور اب ذرا تاخیر سے ہی سہی، اہل سنت و جماعت کے دو عظیم اور مقبول ترین رسالے، الجامعۃ الاشرفیہ کے علمی و فکری ترجمان ”ماہنامہ اشرفیہ“ اور رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی یادگار ”ملت کا ترجمان ماہنامہ جام نور“ اپنے خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں، یہ انتہائی خوش آیند بات اور قابل تعریف قدم ہے-

یہ ساری سرگرمیاں جشن ۱۵۰ سالہ کی تقریبات کا ہی حصہ ہیں لیکن اس سلسلے کا جو کارنامہ زیادہ اہم، مفید اور دیرپا کہا جا سکتا ہے وہ علمائے اہل سنت کی جانب سے دو اہم کتابوں کی اشاعت ہے- ایک تو مولانا عبد المالک مصباحی کی ”جنگ آزادی اور وطن کے جانباز“ ہے جسے ماہ نور پبلیکیشنز دہلی نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے- یہ کتاب اپنی اشاعت کے ساتھ ہی بہت مقبول ہوئی ہے اور پہلا ایڈیشن اختتام کے مرحلے میں ہے- دوسری کتاب وہ ہے جو ابھی تبصرے کی میز پر ہے، یعنی ”انگریز نوازی کی حقیقت“ یہ کتاب جماعت کے مایہ ناز اور معروف قلم کار حضرت مولانا لیٰسین اختر مصباحی صاحب کے اہم کارناموں میں سے ایک ہے- اسے ہم سینہ تقریبات کا حصہ اس معنی کر کے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اتفاقاً اسی سال شائع ہوئی ہے، اس میں اہتمام کا دخل نہیں کیوں کہ اس کا پس منظر کچھ اور ہی ہے-

دراصل جماعت اسلامی ہند کے ترجمان سہ روزہ ”دعوت“ نئی دہلی کے ۷ ستمبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں ڈاکٹر مغل فاروق پرواز، ظہیر منزل، دودھ پور، علی گڑھ کا ایک مضمون ”ایک تحقیق، ایک نقطۂ نظر—برطانوی سامراج کے وفادار اور بھی تھے“ کے عنوان سے شائع ہوا- اس مضمون میں موصوف نے جو کچھ لکھا وہ ان کا یا ان کی جماعت کا نقطۂ نظر تو ہو سکتا ہے، تحقیق سے اس کا کوئی واسطہ نہیں- اپنی پوری تحریر میں انہوں نے جماعت اہل سنت کی سرکردہ اور نمائندہ شخصیات پر درج ذیل بے بنیاد اور سنگین الزامات عائد کیے تھے.

(۱) حق نمک کی ادائیگی کے طور پر فضل رسول بدایونی نے تین کتابیں تصنیف فرمائیں: (۱) سیف الجبار (۲) بوارق محمدیہ (۳) صحیح مسائل— ان تینوں کتابوں کے ذریعہ انہوں نے ایک طرف تو ان علما کو عوام میں بے اثر کرنے کی کوشش کی جو جنگ آزادی میں مصروف تھے اور دوسری طرف عوام کے دلوں میں انگریز حاکم کی عزت و محبت کے لیے راہیں ہموار کرنی شروع کیں- چوں کہ فضل رسول بدایونی خانقاہوں سے بھی جڑے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے وہ کر دکھایا جو مرزا غلام احمد قادیانی نہ کر سکے-

(۲) فضل رسول بدایونی کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں مولانا احمد رضا خاں کو اور حجاز میں مولانا احمد زینی دحلان کو اس کام پر مامور کیا-

(۳) مولانا احمد رضا خاں نے مولانا احمد زینی دحلان سے بازی مارتے ہوئے تین کتابیں تحریر فرمائیں: ۱- اعلام الاعلام بأن هندوستان دار الاسلام ۲- دوام العیش ۳- المحجة المؤتمنة فی آیة الممتحنة-

☆niyaz_mail@yahoo.co.in

مولانا احمد رضا خاں نے انگریزوں سے چندہ وصولی کو بھی جائز ٹھہرایا اور ان کے دور حکومت کو دارالاسلام سے تعبیر کیا۔ اپنے عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مولانا احمد زینی دحلان اور مولانا احمد رضا کی ایک خفیہ ملاقات بھی ہوئی تھی۔

(۴) قادیانی تحریک اور رضا خانی تحریک میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں تحریکوں کے اغراض و مقاصد برصغیر ہند و پاک میں انگریزی حکومت کو استحکام پہنچانا، تحریک آزادی کی مخالفت کرنا، مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانا، انگریزوں کے خلاف جہاد کی مخالفت کرنا، مسلمانوں کی عام تکفیر کرنا، ترک موالات کی مخالفت کرنا وغیرہ ہے۔

(۵) مرزا غلام احمد قادیانی کا دجل و فریب روز اول سے ہی مسلمانان ہند پر مولانا حسین بٹالوی اور شیخ نذیر حسین دہلوی کی کوششوں سے ظاہر ہو گیا۔

(٦) مولانا زینی دحلان نے اپنے انگریز حاکم کی ناجائز خواہشات کی تکمیل کی خاطر ایک کتاب بنام ''خلاصة الكلام في امراء البلد الحرام'' تحریر فرمائی۔ مولانا احمد زینی دحلان نے انگریز کے دور اقتدار کو دارالاسلام سے بھی تعبیر کیا۔

یہی وہ الزامات ہیں جن کی حقیقت واضح کرنے اور ڈاکٹر مغل فاروق پرواز کے پر کترنے کے لیے یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ چونکہ تمام الزامات کا مفاد انگریز نوازی ہے، اس لیے اس کتاب کا نام ''انگریز نوازی کی حقیقت'' رکھا گیا، کتاب کے موضوع اور غرض و غایت کی مناسبت سے اس نام میں جو موزونیت اور معنویت ہے وہ شاید دوسرے نام میں نہیں ہو سکتی تھی، یہ اور بات ہے کہ مضامین کتاب کے ایک معتد بہ حصہ کو ''انگریز نوازی کی حقیقت'' سے کوئی تعلق نہیں۔

جب ڈاکٹر مغل فاروق کا مضمون شائع ہوا تو اولاً کتاب کے مؤلف نے اس کے رد میں ماہنامہ کنز الایمان کے دسمبر ۲۰۰٦ء کے شمارے میں اداریہ لکھا۔ اس کے رد عمل میں ڈاکٹر موصوف نے مؤلف کتاب کے نام اپنی تحریر بذریعہ رجسٹری ارسال کی۔ حضرت مؤلف نے اس کا بھی بہترین جائزہ لیا اور پھر ایک کتاب ہی تالیف کر ڈالی۔

۲۰۸ صفحات کی اس کتاب میں کل سات عناوین کے تحت علمی، تحقیقی اور معلوماتی گفتگو کی گئی ہے۔ ان عناوین کو ابواب کا نام اگرچہ نہیں دیا گیا ہے لیکن وہ ابواب کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔ پہلا عنوان ''آغاز و انجام پرواز'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے، یہ عنوان بڑا ہی چست درست اور مناسب ہے۔ اس عنوان کی گفتگو صفحہ ۵ سے صفحہ ۴۲ تک پھیلی ہوئی ہے۔ ۳۸ صفحات کی یہ بحث تالیف کتاب کے پس منظر، اہل سنت و جماعت کے تئیں مضمون نگار کے اکابرین کی پروپیگنڈہ پالیسی، علمائے اہل سنت کے وہ رویے جن کو غلط طریقے سے بنیاد بنا کر مضمون نگار یا ان کے پیش رووں نے بے بنیاد الزام و بہتان تراشی کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، ان کی حقیقت، وقتی جذبات سے پرے، دور اندیشی اور سنجیدگی پر مبنی اکابرین اہل سنت کے اقدامات کی وضاحت، مضمون نگار کے اسلاف کی دوہری پالیسی اور ابن الوقتی سے متصف کارکردگی، اس پر ان کے ہی اہل خانہ کے شواہد اور مضمون کے الزامات کے خلاف ان کے ہی بہی خواہوں کی کتابوں کے مختصر اقتباسات وغیرہ پر مشتمل ہے۔

اگلا باب ''اجلاس بریلی ۱۹۲۰ء میں وفد علمائے اہل سنت کی حق بیانی'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں برہان ملت مفتی محمد عبدالباقی برہان الحق جبل پوری کے تحریر کردہ اجلاس بریلی ۱۹۲۰ء کے چشم دید واقعات ہیں۔ ان واقعات سے جہاں تحریک خلافت سے تحریک ترک موالات اور تحریک ہجرت تک کی مخالفت کرنے والے علما کی دین داری، دور اندیشی، حق گوئی اور بے باکی کا پتہ چلتا ہے، وہیں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جذبات کی رو میں بہہ جانے والے علما و زعما کس طرح اسلامی اصول اور قوانین شریعت کو دانستہ نادانستہ نظر انداز بلکہ پامال کر رہے تھے۔ بطور نمونہ ذیل میں برہان ملت کی تحریر کا ایک اقتباس بلا تبصرہ پیش ہے:

''(اجلاس میں) میں نے (ابوالکلام) آزاد صاحب سے ذرا بلند آواز سے کہا: آں جناب نے ابھی ابھی اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ مجھ پر تمام الزامات غلط اور بے بنیاد ہیں، جن کا کوئی ثبوت نہیں۔ میری گزارش یہ ہے کہ اخبار زمین دار لاہور کے فلاں نمبر، فلاں تاریخ میں نہایت نمایاں جلی سرخیوں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ناگپور میں خلافت کانفرنس کے پنڈال میں امام الہند ابوالکلام آزاد صاحب نے جمعہ پڑھایا اور خطبہ جمعہ میں مہاتما گاندھی کی صداقت و حقانیت کی شہادت دی، ایک مشرک کی صداقت و حقانیت کی شہادت خطبۂ جمعہ میں! یہ کیسا اسلام ہے؟

یہ سنتے ہی آزاد کا چہرہ فق ہو گیا، ایک دو منٹ تک مجھے دیکھتے رہے پھر بولے لعنة الله على قائله۔ میں نے کہا آزاد صاحب! یہ کلمات لعنت اسی اخبار میں بالاعلان شائع کرا دیجیے تو امید کہ توبہ کے

قائم مقائم ہوجائیں"۔

کتاب کی تیسری سرخی "کون ہے برطانوی سامراج کا سند یافتہ ایجنٹ؟" ہے۔ اصل کتاب کی شروعات یہیں سے ہوتی ہے، اس سرخی کے تحت جو بحث ہے وہ اس اداریہ کی تفصیل ہے جو ماہنامہ کنزالایمان کے دسمبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ باب کتاب کا سب سے ضخیم باب ہے، جو صفحہ ۴۹ سے شروع ہوکر صفحہ ۱۱۷ پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس میں ان تمام الزامات کا نمبروار جواب ہے جو میں نے نقل کیے ہیں، لیکن الزامات کی ترتیب سے نہیں، بلکہ حضرت مؤلف نے ڈاکٹر فاروق کی تحریر کے نکات ترتیب وار حسب ذیل ذکر کیے ہیں۔

(۱) مرزا غلام احمد قادیانی (۲) تینوں علمائے اہل سنت یعنی مولانا احمد رضا بریلوی وعلامہ فضل رسول بدایونی وشیخ احمد بن زینی دحلان شافعی مکی کی مبینہ انگریز نوازی (۳) دارالاسلام اور جہاد (۴) ترک موالات کی مخالفت (۵) عام مسلمانوں میں تفرقہ اور ان کی تکفیر (۶) انگریزوں سے چندہ وصولی (۷) مولانا احمد رضا اور شیخ احمد بن زینی دحلان کی خفیہ ملاقات (۸) مولانا احمد رضا کی تین کتابیں (۹) علامہ فضل رسول بدایونی کی تین کتابیں (۱۰) شیخ احمد بن زینی دحلان کی خلاصۃ الکلام (۱۱) محمد حسین بٹالوی ونذیر حسین دہلوی کی رد قادیانیت کے سلسلے میں تعریف۔

ان ہی نکات/ الزامات کی ترتیب سے ان کے نمبروار تشفی بخش جوابات دیے گئے ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان نکات کے ضمن میں غیر متعلق باتیں بھی در آئی ہیں، مثلاً نکتہ/ الزام نمبر ایک کے تحت ۳۴ صفحات تحریر کیے گئے ہیں جن میں سے ایک صفحہ اہالیان دیوبند کے حصہ میں چلا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قارئین اگر مذکورہ بالا نکات/ الزامات کا نمبروار جواب تلاش کریں تو نکتہ نمبر ۴ کے سلسلے میں مایوسی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

ہیچ مداں کی رائے کے مطابق جوابات مضمون نگار کے الزامات کی ترتیب سے دیے جاتے تو گفتگو زیادہ مربوط ہوتی اور یہ طریقہ تقاضائے جواب پر بھی پورا اترتا۔

چوتھا باب "الزام بلا ثبوت اور دعوی بلا دلیل کے تازہ نمونے" کے نام سے صفحہ ۱۱۸-۱۷۱ پر مشتمل ہے۔ یہ باب کتاب کا دوسرا سب سے ضخیم اور اہم باب ہے۔ اس میں کنزالایمان کے اداریہ کے جواب میں بھیجی گئی ڈاکٹر پرواز کی تحریر کا جواب ہے۔ ڈاکٹر پرواز کی تحریر اداریہ کے مشمولات کی ترتیب کے موافق ہے اور اسی ترتیب سے اس باب میں اس کے جوابات دیے گئے ہیں۔

پھر "قصبہ شاملی کی جھڑپ کا اصل واقعہ" ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں مؤلف کتاب نے اپنے حریف کے ہی اکابرین کی کتابوں کے حوالے سے اس معمولی واقعہ کی حقیقی تصور پیش کی ہے جس کے سہارے زندگی بھر برطانوی سامراج کی مدح سرائی میں رطب اللسان رہنے والے اکابرین دیوبند کو مجاہدین کی صف اول میں کھڑا کیا جاتا ہے اور جس کو ہندوستان کی آزادی کا سنگ میل وغیرہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد بدعات ومنکرات کے رد وابطال میں امام احمد رضا فاضل بریلوی کی خدمات کا مختصر تذکرہ اور "امام احمد رضا پر جدید تحقیق و ریسرچ" بھی شامل کتاب ہے۔

جیسا کہ ماقبل میں اشارہ کیا گیا کہ تیسرا اور چوتھا باب ہی کتاب کا مرکزی حصہ ہے، اس لیے ان دونوں ابواب کو زیادہ وسعت دی گئی ہے۔

مؤلف موصوف نے تمام الزامات کے جواب مستند حوالوں کی روشنی میں دیے ہیں اور بسا اوقات اپنے مدعا کے اثبات کے لیے مضمون نگار کے ہی ہمنواؤں کی عبارتوں سے استدلال کیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک ایک الزام کے ابطال کے لیے انہوں نے پانچ پانچ صفحات کے اقتباسات نقل کیے ہیں، اور جو الزامات مضمون نگار نے اکابرین اہل سنت وجماعت پر عائد کیے ہیں، ان کے جواب میں ایسی مستند عبارتیں نقل کی ہیں جن سے خود مضمون نگار کے اکابرین کی پاک دامانی کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ مثلاً اکابرین اہل سنت پر انگریز نوازی کے الزام کے دفاع میں دلائل کی بھرمار کے بعد حاشیہ سوانح قاسمی مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے حوالہ سے حضرت مؤلف نقل کرتے ہیں کہ "مدرسہ دیوبند کے ذمہ داروں اور مدرسوں کی اکثریت ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پینشنر تھے، جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک وشبہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی"۔

(انگریز نوازی کی حقیقت ص: ۷۳)

"نقطۂ نظر" ناول کا ایک جزء ہے مگر ناول کا کمال یہ ہے کہ اس میں "نقطۂ نظر" اتنا واضح نہ ہو کہ وہ ناول کے فن اور دوسرے اجزاء پر غالب آجائے، گوکہ اس کتاب کا ناول کے فن سے کوئی تعلق نہیں لیکن مذکورہ دو ابواب میں کہیں کہیں ناول کے اس وصف کے برتے جانے کا گمان گزرتا ہے۔

جواب الجواب کے اندر مضمون نگار نے ختم نبوت کا مسئلہ چھیڑ دیا ہے۔ اس پر بھی زیر تبصرہ کتاب میں خاطر خواہ بحث کی گئی ہے۔ غرض کہ کسی بھی الزام کے ابطال یا دعوی کے اثبات کے لیے اتنے اور ایسے دلائل فاضل مؤلف نے جمع فرما دیے ہیں جن کے بعد کسی بھی صحیح طبیعت اور سلیم عقل والے کے لیے چوں و چرا کی گنجائش نہیں رہنی چاہیے۔ اسی لیے اخیر میں مضمون نگار ڈاکٹر فاروق کو جرأت و دیانت داری کے ساتھ اپنے الزامات واپس لینے کی دعوت دی گئی ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ اب بھی اپنے بے بنیاد موقف پر قائم رہتے ہیں تو ان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ امام احمد رضا کی کتب و رسائل سے ایسی عبارتیں پیش کریں جن سے وہ اپنا مدعا ثابت کر سکیں۔

امام احمد رضا کے مستند اقوال نہیں تو ان کے اعمال اور انگریزوں سے تعلقات و مفادات حاصلہ کا کوئی بھی ایک دستاویزی ثبوت فراہم کریں۔ اس قسم کے اور بھی مطالبے کیے گئے ہیں، جن سے یہ گمان غالب ہے کہ مضمون نگار مبہوت ہو گئے ہوں گے۔

کتاب میں خلافت تحریک پر جستہ جستہ خاصہ مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ اس لیے اس کتاب کا مطالعہ مذکورہ الزامات اور ان کے جوابات سے ہٹ کر تحریک خلافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی حد درجہ مفید ہے۔

پروف ریڈنگ اور املا کی غلطیاں اردو کتابوں کے لیے گویا لازم ہیں، اس لیے یہ کتاب بھی اس سے پاک نہیں۔ ترتیب و پیش کش بھی خوب ہے لیکن خوب تر کے امکانات ابھی بھی روشن ہیں۔ ان باتوں سے قطع نظر کتاب فی الجملہ بیش قیمت اور قابل مطالعہ ہونے کے ساتھ نئی نسل کے لیے ایک لازوال سرمایہ ہے۔

ادارتی نوٹ - فاضل مصنف مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب نے یہ کتاب اس نیت سے لکھی ہے کہ علمائے اہل سنت پر انگریز نوازی کا الزام دھرنے والے خصوصاً جناب مغل پرواز صاحب اپنے الزامات واپس لیں یا اگر ان کے پاس کچھ کہنے کی معقول بات ہے تو وہ اسے پیش کریں، مصنف نے بڑی محنت سے کتاب کو معترضین کے بڑے حلقے تک پہنچا دیا ہے مگر ہر طرف سناٹا ہے، جناب مغل پرواز صاحب تو اب مصباحی صاحب کا فون بھی نہیں اٹھاتے جب کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے ان کا رویہ ایسا نہیں تھا۔ ☆☆☆

بقیہ: حاصل مطالعہ —— یہ کام زیادہ سے زیادہ کراہت انگیز بنا دینا چاہیے، اگر مجرم کام پورا نہ کرے تو فوجی کوتوال تازیانے لگوائے، اپنے حصہ کا کام کر چکنے کے بعد مجرم کو پھانسی دے دی جائے، اس غرض سے پھانسی پاس ہی نصب کی جائیگی۔ (ص ۱۱۱)

یہ تو مشت نمونہ از خروارے پیش کیا گیا، جو لوگ تاریخ سے شغف رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجاہدین آزادی کے ساتھ اس سے بھی دردناک سلوک کیا گیا، اس کے باوجود کچھ ایسے بھی لوگ تھے جنہیں انگریزی حکومت کے زیر سایہ بڑا امن و سکون تھا، وہ اس حکومت کی ظالمانہ کارگذاریوں سے بہت مطمئن تھے اور ان کا سایہ تا دیر قائم رہنے کے لئے ان کے دلوں سے دعائیں نکلتی تھیں، علامہ عبد الحکیم اختر نے درجنوں ایسے لوگوں بالخصوص علماء کا ذکر معتمد حوالوں کی روشنی میں کیا ہے، میں یہاں صرف ان کی کتاب کے ایک ایک اقتباس کا خلاصہ ذکر کرتا ہوں جو ''ڈپٹی نذیر احمد دہلوی'' سے تعلق رکھتا ہے، علامہ صاحب لکھتے ہیں۔

ڈپٹی صاحب دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک العلی نانوتوی کے شاگرد ہیں، برٹش گورنمنٹ نے ان کے کارناموں کے پیش نظر انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا، انگریزی سناپتوں سے خوب فیضیاب ہوئے، دوستی اس قدر نبھائی کہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے، اپنے مخصوص نظریات کی روشنی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا، انگریزوں نے ان پر جو انعام کیا زندگی بھر اس کی دہائی دیتے رہے۔

افتخار عالم بلگرامی، مؤلف ''حیات نذیر'' مطبوعہ شمسی پریس دہلی، صفحہ ۱۳۷ پر ڈپٹی صاحب کی انگریز وفاداری کا بیان اس انداز میں کرتے ہیں

خدا کی بے انتہا مہربانی اس کی مقتضی ہوئی کہ انگریز بادشاہ ہوئے۔ ہم نے خدا کے فضل سے انگریزی عملداری میں آنکھ کھولی ہے، خدا اس کو ابد الآباد تک سلامت رکھے۔!!

ڈپٹی صاحب انگریز حکومت کے انتظام و انصرام سے بہت مانوس تھے، انگریزوں کے زیر سایہ ان کی زندگی بہت خوشحال تھی، اس پر وہ اپنے رب کے بڑے شکر گذار بھی تھے، بلگرامی صاحب ان کا بیان کچھ اس طرح نقل کرتے ہیں شکر ہے کہ ہم رعایا بھی بے نوائیوں کی جن کی عملداری میں ہم کو اپنی سلطنت (مسلم حکومت) سے زیادہ آرام و آسائش ہے۔!! (مشعل راہ، ص ۲۴۷)

دینی، علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں

شہر ڈیوزبری برطانیہ میں محدث اعظم ایجوکیشن سنٹر اور مسجد مدنی کا افتتاح

الحمد للہ! اس سال محدث اعظم مشن شاخ ڈیوزبری نے ایک انتہائی کامیاب اور نمایاں پیش رفت کرتے ہوئے مشن کے سنٹر کے طور پر ایک عمارت خرید لی اور تقریباً دو لاکھ پونڈ کے صرفے سے یہ سنٹر اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ مکمل بھی ہو گیا اور ۸؍جون ۲۰۰۷ء کو نبیرۂ سرکار کلاں حضرت علامہ سید احسن اشرف اشرفی الجیلانی نے پہلی نماز جمعہ پڑھا کر مسجد مدنی کا افتتاح فرمایا اور دوسرے دن ۹؍جون بروز سنیچر اسی سنٹر میں جشن افتتاح کا پروگرام بعد نماز ظہر تا عصر منعقد ہوا، جس کی صدارت نبیرۂ سرکار کلاں مدظلہ نے فرمائی اور نظامت کے فرائض مولانا خلیل اطہر اشرفی رامپوری نے انجام دیے، مولانا نوید اشرفی صاحب نے انگریزی میں خطاب فرمایا- حضرت مولانا محمد ایوب اشرفی (بولٹن) مولانا قمر احمد اشرفی (بلیک برن) اور حضرت علامہ شاہد رضا نعیمی اشرفی صاحب نے خصوصی خطاب فرمایا- مقررین کرام نے سرزمین برطانیہ پر دین و سنیت کے حوالے سے حضور شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں صاحب مدظلہ العالی کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ''محدث اعظم مشن ڈیوزبری'' کے ذمہ داران واراکین کو مبارک باد پیش کیا اور انہیں اتحاد واتفاق، خلوص ومحبت اور محنت ولگن سے کام کرنے کا خیر خواہانہ مشورہ دیا-

مولانا فاروق اشرفی صاحب نے نعت پاک کا نذرانہ پیش کیا، صلوٰۃ وسلام اور نبیرۂ سرکار کلاں کی دعاؤں پر جلسے کا اختتام ہوا-

رپورٹ ——— محدث اعظم مشن ڈیوزبری، برطانیہ

بھدراوتی کرناٹک میں جشن رحمت عالم وغوث اعظم

۲۸؍مئی ۲۰۰۷ء بروز جمعہ بعد نماز عشاء قلعہ قاضی محلہ بھدراوتی میں انجمن پیغام رضا ٹرسٹ کے پرچم تلے ایک روزہ جشن رحمت عالم وجشن غوث اعظم وعرس پاسبان ملت علامہ مشتاق احمد نظامی بہت ہی عظمت واحترام کے ساتھ منایا گیا جس میں مولانا نفیس حبیبی صاحب ٹمکور، مفتی مقصود حسین رضوی شموگہ شہر کے علمائے کرام اور ائمہ مساجد اہل سنت نے شرکت فرمائی اور بیانات بھی ہوئے، محسن اہل سنت عالی جناب محمد صادق اللہ صاحب رضوی ایڈوکیٹ متولی مسجد اعظم چتر درگہ نے امام عشق ومحبت سیدنا اعلیٰ حضرت کی تعلیمات پر بہت ہی جامع تقریر فرمائی-

آخر میں خلیفۂ سرکار مفتی اعظم ہند حضرت مولانا محمد لیاقت رضا نوری ناظم اعلیٰ دار العلوم رضویہ غریب نواز رضا نگر اجین، ایم پی، بانی وسرپرست انجمن پیغام رضا ٹرسٹ نے نعرۂ تکبیر ورسالت کی گونج میں ولولہ انگیز تقریر فرمائی- آخر میں صلاۃ وسلام اور حضرت کی دعا پر جلسے کا اختتام ہوا-

رپورٹ! ——— محمد امین رضوی، انجمن پیغام ٹرسٹ، بھدراوتی، کرناٹک

مولانا اوکاڑوی اکادمی (العالمی) اور سواد اعظم اہل سنت

کی اپیل پر ہر سال ماہ رجب کے تیسرے جمعۃ المبارک کو

یوم خطیب اعظم پاکستان

منایا جاتا ہے- ملک و بیرون ملک اہل سنت و جماعت کی تمام مساجد میں ائمہ وخطباء کرام، خطبات جمعہ میں مجدد مسلک اہل سنت، محسن ملک وملت، عاشق رسول، محب صحابہ وآل بتول، محبوب اولیاء، خطیب اعظم پاکستان حضرت الحاج علامہ قبلہ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی قدس سرہ الباری ورفع اللہ درجتہ کو خراج عقیدت ومحبت پیش کرتے ہیں اور ایصال ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کرتے ہیں- ان کا یہ عمل اہل سنت وجماعت کے محسن و ممدوح سے اظہار محبت وعقیدت بھی ہے اور مسلک حق کی تائید بھی-

حسب سابق اس سال بھی ان شاء اللہ ماہ رجب کی تیسری جمعرات و جمعہ کو جامع مسجد گلزار حبیب، گلستان اوکاڑوی (سولجر بازار) کراچی میں سالانہ دو روزہ مرکزی عرس مبارک کی تقریبات ہوں گی- آپ سے گزارش ہے کہ اہل سنت کے مراکز اور مساجد و مدارس میں حضرت خطیب اعظم پاکستان علیہ الرحمۃ والرضوان کو ایصال ثواب کے لیے جمعہ 3؍اگست 2007ء کو ''یوم خطیب اعظم پاکستان''

منانے کا اہتمام کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔(جزاکم اللہ تعالیٰ)

رپورٹ: ——— مولانا اوکاڑوی اکادمی (العالمی) کراچی (پاکستان)

گھوسی میں عرس شیخ العلماء

خلیفہ صدر الشریعہ امام الادب شیخ العلماء حضرت علامہ الحاج الشاہ مفتی اویس حسن غلام جیلانی اعظمی رضی اللہ عنہ سابق شیخ الحدیث و صدر دار العلوم اہل سنت فیض الرسول براؤں شریف کا عرس مقدس سالہائے گزشتہ کی طرح امسال بھی نہایت شرعی اہتمام کے ساتھ ۱۵ر ربیع الآخر مطابق ۳ر مئی ۲۰۰۷ء بروز جمعرات منعقد ہوا۔ بعد نماز فجر قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا، اس کے بعد نعت خوانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعدہٗ ۷ بج کر ۳۵ منٹ پر قل شریف ہوا اور راقم الحروف نے شجرہ خوانی کی۔ صلاۃ وسلام کے بعد چادر وگل پوشی ہوئی، پھر بعد نماز عشاء جامعہ امجدیہ رضویہ گھوسی کے وسیع وعریض صحن میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا الحاج علاء المصطفیٰ قادری ناظم اعلیٰ جامعہ امجدیہ گھوسی نے کی، جبکہ براؤں شریف سے تشریف لائے ہوئے مہمان مولانا مسعود رضا صاحب اور مولانا فداء المصطفیٰ قادری، مولانا مفتی شمشاد احمد استاذ جامعہ امجدیہ ومولانا ممتاز احمد نوری نے حضرت شیخ العلماء کے اعلیٰ کارنامے وتقویٰ وپرہیزگاری کو اپنی تقریروں میں خوب واضح کیا اور اسٹیج پر مولانا جمال مصطفیٰ قادری پرنسپل جامعہ امجدیہ، مفتی آل مصطفیٰ صاحب، مولانا احمد رضا جیلانی، مولانا محمد نوری جیلانی وغیرہ موجود رہے۔ صلاۃ وسلام کے بعد شہزادۂ صدر الشریعہ مولانا فداء المصطفیٰ صاحب قادری کی دعاؤں پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

رپورٹ ——— محمد معین اختر الجیلانی، خادم آستانہ شیخ العلماء، گھوسی، مئو

عرس مفتی امیر ملت نوساروی

شہر نوساری میں آرام فرما بوئے گلستان رسالت، گل گلزار غوثیت، چراغ بزم چشتیت، بہار باغ رفاعیت، امیر ملت حکیم قاری مولانا مفتی الشاہ سید امیر الدین جیلانی القادری چشتی نظامی رفاعی نوساروی علیہ الرحمہ کا سالانہ عرس پاک موجودہ صاحب سجادہ پیر طریقت حضرت مولانا سید ابو محمد معین الدین فقیر اللہ صاحب قبلہ کی سرپرستی میں نہایت تزک واحتشام کے ساتھ منایا جا رہا ہے۔

۲۹ر رجب المرجب ۱۴۲۸ھ کو صبح ۱۰ بجے قرآن خوانی ہوگی بعد نماز ظہر جلوس صندل نکلے گا، بعد نماز عصر صندل چادر وگل پوشی اور حلقۂ ذکر ہوگا، بعد نماز مغرب راتب رفاعی کا جلسہ ہوگا اور بعد نماز عشاء علمائے اہل سنت کے بیانات ہوں گے بعد میں صلوٰۃ وسلام ہوگا۔

۳۰ر رجب المرجب ۱۴۲۸ھ کو صبح ۹ بجے قرآن خوانی ہوگی بعد میں محفل میلاد شریف ہوگا اور صلوٰۃ وسلام اور فاتحہ، شجرہ خوانی اور قل شریف پر عرس مفتی امیر ملت علیہ الرحمہ کی تقریبات اختتام پذیر ہوگا، تشریف لاکر فیضان اولیاء سے مالا مال ہوں۔

رپورٹ ابراہیم اسماعیل نکرانی، عرس مفتی امیر ملت کمیٹی، گجرات

کتابی سلسلہ ”ایوان نعت“

نعتیہ شاعری کو تحریک کی شکل دینے کی غرض سے اخبار اڑیسہ پبلی کیشنز نے ”ایوان نعت“ کے نام سے ایک کتابی سلسلہ کے اجرا کا فیصلہ کیا ہے۔ اس میں شامل ہونے کے لیے شعرائے کرام اپنی ایک نمائندہ نعت پاک بایوڈیٹا اور تصویر کے ساتھ مدیر اعزازی جناب محمد فرحت حسین خوشدل کو ارسال کریں۔ ساتھ میں اس کتاب کی پیشگی قیمت ۱۰۰؍ روپے بھی بھیجیں۔ کتاب شائع ہوتے ہی کاپی آپ کو بھیج دی جائے گی۔ نعت پاک بھیجنے کا پتہ:

Md Farhat Hussain Khushdil
Deptt of Urdu+2 Zilla School
Hazaribagh-625301(Jharkhand)

رقم بھیجنے کا پتہ: Editor-Akhbar-e-Orissa
Dewan Bazar, Cuttack-753001

اہم اعلان قارئین کرام! ہمیں آپ کو یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے ایسے بے شمار قارئین ہیں جنہیں جام نور مسلسل بھیجا جا رہا ہے، مگر مہینوں بلکہ سالوں گزر جانے کے بعد بھی انہوں نے اپنی ممبر شپ کی تجدید نہیں کروائی ہے۔ ان کی بے توجہی سے مجبور ہو کر ہم نے پچھلے ماہ بے شمار ممبروں کے نام رجسٹر سے خارج کر دیے اور انہیں رسالے کی ترسیل بند کر دی ہے——آپ کو ملنے والے رسالے کے لفافے پر (پتے کے اوپر) اس شکل میں 3040/Jan-06-Dec.07 آپ کی ممبری فیس کی مدت لکھی ہوئی ہے، براہ کرم رسالہ پڑھنے سے قبل اسے دیکھ لیں، اگر آپ کی ممبری فیس ختم ہو گئی ہو تو اولین فرصت میں تجدید کرا لیں، ورنہ ہم آپ کو بھی رسالہ بھیجنے سے معذور ہوں گے۔ ادارہ

تبلیغِ قرآن وسنت کی عالمگیر غیر سیاسی تحریک "دعوتِ اسلامی" کے علمی وتحقیقی ادارے

"المدینۃ العلمیۃ" کی مایہ ناز پیشکش

اعلیٰ حضرت، امامِ اہلسنت، مجدّدِ دین وملت، پروانۂ شمعِ رسالت الشاہ الامام **احمد رضا خان** علیہ رحمۃ الرحمٰن

کی مشہور ومعروف عربی تصنیفِ لطیف

جَدُّ المُمتَار علیٰ رَدِّ المُحتَار (المجلد الثانی)

خوبصورت انداز میں جدید عربی رسم الخط اور نئی ترتیب کے ساتھ "**مکتبۃ المدینہ**" باب المدینہ کراچی کے تعاون سے منظرِ عام پر آچکی ہے۔

اس عظیم پیشکش کی چند خصوصیات:

(۱) آیاتِ قرآنیہ کو خوبصورت اور دلکش خط "خطِ عثمانی" میں پیش کرنے کا اہتمام۔

(۲) تراجمِ اعلام وکتب کا التزام

(۳) رد المحتار کی عبارات میں بقدرِ ضرورت ما الحق وما سبق عبارات کا اضافہ۔

(۴) رد المحتار کی عبارات کی اس انداز میں تخریج کہ قاری کسی بھی نسخہ کی مدد سے کلام علامہ شامی علیہ رحمۃ اللہ القوی نکال سکے۔

(۵) اعلیٰ حضرت علیہ رحمۃ الرحمٰن کے بیان کردہ دلائل کی اصل ماخذ ومراجع سے تخریج۔

(۶) امامِ اہلسنت علیہ رحمۃ الرحمٰن کے بیان کردہ اشارات کی وضاحت بصورتِ تخریج۔

(۷) اعلیٰ حضرت علیہ رحمۃ الرحمٰن نے رد المحتار یا در مختار کی جس عبارت پر بھی کلام فرمایا انہیں ترتیب وار متقولہ میں پیش کیا گیا ہے۔

(۸) اعلیٰ حضرت علیہ رحمۃ الرحمٰن کے فتاویٰ جات کے مشہور مجموعے "فتاویٰ رضویہ" سے "رد المحتار" کی ایسی عبارات کا انتخاب جن کے بارے میں آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کچھ تحریر فرمایا۔

(۹) آیاتِ قرآنیہ، احادیث، مطالب، تراجمِ اعلام وکتب ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے فہارس پیش کی گئی ہیں۔

پیشکش **"المدینۃ العلمیۃ"** عالمی مدنی مرکز فیضانِ مدینہ محلّہ سوداگران پرانی سبزی منڈی باب المدینہ کراچی۔ فون: ۴۹۲۱۳۸۹-۹۰-۹۱

اس کتاب کی پہلی اور دوسری جلد مکتبۃ المدینہ اور معروف مکاتبِ اہلسنت پر دستیاب ہے۔

مکتبۃ المدینہ

مکتبۃ المدینہ فیضانِ مدینہ محلہ سوداگراں پرانی سبزی منڈی باب المدینہ کراچی فون: 4921389

کراچی: شہید مسجد کھارادر فون: **2203311**
حیدرآباد: فیضانِ مدینہ آفندی ٹاؤن۔ فون: **3642211**
ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: **4511192**
لاہور: دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ، لاہور۔ فون: **7311679**
کوئٹہ: نزد ریلوے اسٹیشن، ڈی ایس آفس۔
سردارآباد (فیصل آباد): امین پور بازار۔ فون **2632625**
آزاد کشمیر: چوک شہیداں میرپور۔
پشاور: فیضانِ مدینہ گلبرگ نمبر ۱، النور اسٹریٹ، صدر۔ فون **5279844**